معصومیت انبیاء علیہ السلام

مؤلف

ابواللیث غلام محمد میمن

Marfat.com

Marfat.com

معصومیتِ انبیاء علیہم السلام

مرتب

ابو اللیث غلام محمد میمن
فاضل مدرسہ عربیہ مظہر العلوم کھڈہ کراچی
مہتمم مدرسہ مفتاح العلوم حمادیہ فیض واہ
ضلع خیر پور میرس

اسلامیکا فائونڈیشن، پبلشرس

Marfat.com

معصومیتِ انبیاء علیہم السلام

تالیف: ابواللیث مولانا غلام محمد میمن

اشاعت اول: 2015ء

کمپیوٹر لے آؤٹ: ندیم احمد سولنگی

طابع: ذکی سنز پرنٹرس، کراچی

ناشر: اسلامیکا فاؤنڈیشن، پبلشرس

قیمت: 350روپے

تقسیم کار

حیدرآباد: سندھیکا بوک شاپ، 23ٹریڈ سینٹر، حیدر چوک، گاڑی کھاتہ فون: 0301-3594679
سکھر: سندھیکا بوک شاپ، 19 بلدیہ پلازا گھنٹہ گھر چوک سکھر۔ فون: 071-5628368

Marfat.com

فہرست

پیش لفظ ۹

تقریظ: پیر طریقت شیخ التفسیر والحدیث حضرت مولانا مفتی عبد الوھاب صاحب ۱۲

مقدمہ: عصمت انبیاء علیہم السلام کے متعلق ۱۵

حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق ابحاث ۲۹

کیا حضرت آدم علیہ السلام سے عصیان ہوا تھا؟ ۲۹

حضرت آدم علیہ السلام کی عصمت ۳۱

دوسری بحث: حضرت آدم علیہ السلام کا بھول جانا ۳۴

تیسری بحث: حضرت آدم کا اپنے آپ کو ظالم کہنا ۳۴

ابحاث حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق ۳۵

بحث اول: نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اپنے بیٹے کے متعلق نجات کا سوال کرنا ۳۵

بحث ثانی: کہتے ہیں کہ یہ بیٹا نوح علیہ السلام کا صلبی نہیں تھا بلکہ انکی اہلیہ کا زنا سے تھا۔ ۳۵

بحث ثانی کی وضاحت: ۳۵

بحث اول کی وضاحت: ۳۶

ابحاث حضرت لوط علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق ۴۱

بحث اول: حضرت لوط علیہ السلام نے قوم کے فساق کو اپنی لڑکیوں کی پیشکش کیسے کی؟ ۴۱

وضاحت بحث اول: ۴۲

دوسری بحث۔ لوط علیہ السلام کا رکن شدید کی طلب کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ ۴۳

Marfat.com

ابحاث حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ۴۵
بحث اول: کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام احیاء الاموات پر ایمان نہیں رکھتے تھے؟ ۴۷
بحث ثانی: کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام چاند ستاروں کو رب مانتے تھے؟ ۴۸
بحث ثالث: حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے کافر باپ کیلئے مغفرت کی طلب کرنا: ۵۰
بحث رابع: حضرت ابراہیم علیہ السلام کا فرشتوں کے سامنے کھانا رکھنا: ۵۳
بحث خامس: کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین جھوٹ بولے ہیں؟ ۵۵

ابحاث حضرت یعقوب علیہ السلام کے متعلق ۶۴
پہلی بحث: حضرت یعقوب علیہ السلام کا حضرت یوسف علیہ السلام سے زیادہ محبت کرنا ۶۴
دوسری بحث: جب حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق خطرہ بھی تھا تو پھر کیوں ساتھ بھیجا؟ ۶۵
تیسری بحث: حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے لڑکوں کو جھوٹا سمجھنے کے باوجود حضرت یوسف علیہ السلام کی تلاش کیوں نہیں کی؟ ۶۵
چوتھی بحث: حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں تجربہ رکھنے کے باوجود بن یامین کو انکے ساتھ کیوں روانہ کیا؟ ۶۶
پانچویں بحث: حضرت یعقوب علیہ السلام کے لڑکوں کا اپنے باپ کو لفی ضلال مبین کہنا۔ ۶۶
چھٹی بحث: حضرت یعقوب علیہ السلام کا حضرت یوسف علیہ السلام کے فراق میں اتنا رونا کہ نظر بھی چلی گئی کیا یہ بے صبری نہیں؟ ۶۸
ساتویں بحث: حضرت یعقوب علیہ السلام کا انما اشکو بثی وحزنی الی اللہ کہنا۔ ۶۹
آٹھویں بحث: حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف سے بھائیوں کو پہلی مرتبہ واپس کی ہوئی مالیت حضرت یعقوب علیہ السلام نے کیوں قبول کی؟ ۶۹

ابحاث حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق ۷۱
پہلی بحث: حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنی مصنوعی غلامی دکھانا ۷۱
دوسری بحث: حضرت یوسف علیہ السلام کو عورت کا بلانا ۷۱
تیسری بحث: کیا حضرت یوسف علیہ السلام نے ارادہ کیا تھا؟ ۷۳
نفس کا امارہ ہونا: ۷۸
چوتھی بحث: حضرت یوسف علیہ السلام کی عفت کے متعلق۔ ۷۸
پانچویں بحث: حضرت یوسف علیہ السلام کا جیل یعنی قید خانہ کو بہتر سمجھنا: ۸۰

Marfat.com

چھٹی بحث: حضرت یوسف علیہ السلام کی جیل کے ساتھیوں سے گفتگو: ۸۱

ساتویں بحث: حضرت یوسف علیہ السلام کا وزیر خزانہ ہونے کی طلب کرنا: ۸۳

آٹھویں بحث: حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والد محترم کو حالات کی اطلاع کیوں نہیں دی؟ ۸۳

نویں بحث: کیا حضرت یوسف علیہ السلام نے بنیامین کے سامان میں کٹورہ خود رکھا تھا؟ ۸۴

دسویں بحث: یوسف علیہ السلام نے غلہ کی مالیت کیوں واپس کی تھی؟ ۸۶

گیارھویں بحث: حضرت یوسف علیہ السلام کو سجدہ کیسے؟ ۸۷

بارھویں بحث: تصدق علینا کا مطلب کیا ہے؟ ۸۸

خلاصہ کلام: ۸۸

ابحاث حضرت ایوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق ۹۰

بحث ۱: حضرت ایوب علیہ السلام کا قول ہے ۹۰

بحث ۲: حضرت ایوب علیہ السلام کیلئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "ہم نے ان کو بڑا صابر پایا" ۹۱

بحث ۳: حضرت ایوب نے اس تکلیف کو شیطان کی طرف کیوں منسوب کیا؟ ۹۲

ابحاث حضرت شعیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق ۹۵

بحث اول، کیا حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی لڑکی کا نکاح غیر کفو میں کیا؟ ۹۵

دوسری بحث: کیا حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی لڑکی کا نکاح بغیر گواہوں کے کیا؟ ۹۶

تیسری بحث: کیا شوہر کی خدمت بیوی کا مہر ہو سکتی ہے؟ ۹۶

چوتھی بحث: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اُجرت پر لینا ۹۷

پانچویں بحث: کیا حضرت شعیب علیہ السلام نبوت سے پہلے کفر پر تھے؟ ۹۸

ابحاث حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق ۱۰۰

بحث اول: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قبطی کو قتل کرنا۔ ۱۰۰

دوسری بحث: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اسرائیلی کو انک لغوی مبین کہنا ۱۰۴

تیسری بحث: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ سے انی اخاف ان یکذبون کہنا ۱۰۵

چوتھی بحث: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جادوگروں کو جادو دکھانے کی اجازت کیوں دی؟ ۱۰۶

پانچویں بحث: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سانپ اور فرعونیوں سے ڈرنا؟ ۱۰۶

چھٹی بحث: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے زبور کی تختیاں کیوں پھینکیں؟ ۱۰۸

ساتویں بحث: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کی داڑھی پکڑ کر گناہ کیا ۱۰۸

آٹھویں بحث: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت خضر علیہ السلام کے طرز عمل پر اعتراض کرنا ۱۱۰

Marfat.com

نویں بحث: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقتول لڑکے کو نفس زکیہ کہنا ۱۱۱
دسویں بحث: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لاتؤاخذنی بمانسیت کہنا ۱۱۱

حضرت خضر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق ابحاث ۱۱۳
بحث اول: حضرت خضر علیہ السلام کا مسکینوں کی کشتی توڑنا ۱۱۳
دوسری بحث: حضرت خضر کا نابالغ لڑکے کو قتل کرنا، کیا حکمت تھی؟ ۱۱۳
تیسری بحث: کشتی کے مالک ہونے کے باوجود وہ مسکین کیسے؟ ۱۱۵

ابحاث حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق ۱۱۶
بحث اول: کیا حضرت داؤد علیہ السلام اوریا کی بیوی پر عاشق ہوئے تھے؟ معاذاللہ ۱۱۷
بحث ثانی: خشیت اور خوف میں فرق ۱۲۴
تیسری بحث: حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے فیصلے ۱۲۵

حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق ابحاث اور ہاروت ماروت کے متعلق وضاحت ۱۲۷
بحث اول: حضرت سلیمان علیہ السلام پر کفر و جادو کے الزام کا رد ۱۲۸
بحث ثانی: ہاروت اور ماروت کے متعلق مشہور قصہ سراسر جھوٹ ہے ۱۲۹
فرشتوں کو انسانوں کی طرف بھیجنے میں کیا حکمت تھی؟ ۱۳۲
تیسری بحث: کیا حضرت سلیمان علیہ السلام سے نماز میں غفلت ہوئی تھی؟ ۱۳۵
چوتھی بحث: القینا علیٰ کرسیہ جسدا کا مطلب ۱۳۷
پانچویں بحث: حضرت سلیمان علیہ السلام کا بلقیس کی پنڈلیوں کو دیکھنا ۱۴۷
چھٹی بحث: حضرت سلیمان علیہ السلام کا اقتدار کی طلب کرنا ۱۴۹
ساتویں بحث: چیونٹی کا حضرت سلیمان اور ان کے لشکر سے ڈرنا 151
آٹھویں بحث: حضرت سلیمان علیہ السلام کا انتقال 151

کیا حضرت عزیر علیہ السلام کو حیات بعد ممات کا یقین نہیں تھا؟ ۱۵۴
بحث: کیا حضرت عزیر کو حیات بعد ممات کا یقین نہیں تھا؟ ۱۵۴

ابحاث حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق ۱۵۶
بحث اول: اذ ذھب مغاضبا ۱۵۷
دوسری بحث: کیا حضرت یونس علیہ السلام اللہ تعالیٰ کو مؤاخذہ پر قادر نہیں سمجھتے تھے؟ ۱۶۰
تیسری بحث: حضرت یونس علیہ السلام کا اپنے آپ کو ظالم کہنا ۱۶۲

Marfat.com

چوتھی بحث: حضرت یونس علیہ السلام کا اپنے اجتہاد سے ہجرت کرنا ۱۶۲

ابحاث حضرت زکریا علیہ السلام کے متعلق ۱۶۴
بحث اول: کیا حضرت زکریا علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے قادر مطلق ہونے کا یقین پہلے سے نہیں تھا؟ .. ۱۶۴
بحث ثانی: حضرت زکریا علیہ السلام کا وارث طلب کرنا کیا معنی رکھتا ہے ۱۶۵

بحث: حضرت یحیٰ علیہ السلام کے متعلق ۱۶۶
حضرت یحیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا حصور ہونا ۱۶۶

ابحاث حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ۱۶۹
بحث اول: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا صفائی دینا ۱۶۹
لفظ نفس کی تحقیق ۱۷۰

بحث: حضرت مریم علیہا السلام کا موت کی تمنی کرنا ۱۷۲
حضرت مریم علیہا السلام کا موت کی تمنی کرنا ۱۷۲

ابحاث حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ۱۷۳
پہلی بحث: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابلاغ رسالت کے متعلق ۱۷۳
دوسری بحث: کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فقراء المسلمین کو دھتکارا تھا؟ ۱۷۵
تیسری بحث: جنگ بدر کے قیدیوں کے متعلق ۱۷۷
چوتھی بحث: منافقین کے اجازت طلب کرنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اجازت دینا کیا آپکی غلطی تھی: ۱۷۸
پانچویں بحث: لقد تاب اللہ علی النبی کے متعلق ۱۷۹
چھٹی بحث: کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی الٰہی میں شک تھا؟ ۱۸۱
ساتویں بحث: کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کفار کی باتوں کی طرف مائل ہوئے تھے ۱۸۳
آٹھویں بحث: کیا شیطان وحی الٰہی میں اپنی بات ملا سکتا ہے؟ ۱۸۶
نویں بحث: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو "اتق اللہ" کے حکم کے متعلق ۱۹۰
دسویں بحث: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت زینب سے نکاح کرنا ۱۹۳
گیارہوں بحث: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا لوگوں سے ڈرنا ۱۹۹
بارہویں بحث: کیا انبیاء علیہم السلام سے شرک صادر ہو سکتا؟ ۲۰۰
تیرہویں بحث: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان کے متعلق ۲۰۲
چودہویں بحث: کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم توحید کے معاملہ میں متردد تھے؟ ۲۰۳

Marfat.com

پندرہویں بحث: آپ ﷺ کو استغفار کے حکم کے متعلق ۲۰۴
سولہویں بحث: آپ ﷺ کا حلال کو حرام کرنا ۲۰۷
سترہویں بحث: آپ ﷺ نے منہ میں تیوری چڑہائی ۲۰۸
اٹھارہویں بحث: آپ ﷺ کے متعلق ضال کا لفظ ۲۰۹
انیسویں بحث: آپ ﷺ کے متعلق لفظ وزر ۲۱۱

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

بچپن کے زمانہ میں بڑے، بچوں کے دل بہلانے کے لئے انہیں کچھ قصے، کہانیاں سنایا کرتے ہیں اور بچے بھی بڑی توجہ اور دل لگی سے سنا کرتے ہیں۔ یہی حال ہمارا تھا کہ ایسے قصے پسند کیا کرتے تھے۔ بادشاہوں کے من گھڑت قصوں کے ساتھ کبھی انبیاء علیہم السلام کے بھی قصے سنا کرتے تھے، حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق سنتے تھے کہ انہیں ایک عورت سے عشق ہو گیا اور حضرت داؤد علیہ السلام کو پہلے ہی ننانوے بیویاں تھیں لیکن عشق کی وجہ سے حضرت نے اس عورت کے شوہر کو مروایا اور اس سے شادی کی اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی صورت میں حضرت داؤد علیہ السلام کو دنبیوں کے فیصلہ سے متنبہ کیا۔ اور ہاروت ماروت کے متعلق سنتے تھے کہ وہ ہیں تو فرشتے لیکن انسانی شکل میں آئے اور ان کا ایک کنجری سے ناجائز تعلق ہوا اور کنجری تو فرشتوں کے بتائے ہوئے اسم اعظم کی وجہ سے زہرہ ستارہ بن گئی اور یہ بیچارے بابل کے کنویں میں ابھی تک لٹکائے ہوئے ہیں اور قیامت تک اس سزا میں رہیں گے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق سنتے تھے کہ ان کی بادشاہی کا کمال ایک انگوٹھی میں تھا۔ وغیرہ وغیرہ ایسے قصے سن کر ہم بھی محظوظ ہوتے تھے اور ہمارے دماغ کی تختی پر ان مٹ سیاہی کی صورت میں منقش ہو جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہوئی کہ مدارس میں داخل ہوئے اور علوم دینیہ کی روشنی نصیب ہوئی اور روشنی میں تو صحیح اور غلط کا امتیاز کرنا بالکل آسان ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

تو دیکھا کہ انبیاء علیہم السلام کے متعلق، ایسے رطب و یابس جو قصے منسوب کئے گئے ہیں یہ درحقیقت توحید باری تعالیٰ کے دشمن اور ہوا پرستوں کی سازشیں تھیں، جس سے وقت کے پیغمبر کو مطعون کرکے وہ اپنا مقصد پورا کرتے تھے۔

اور دین کے ان دشمنوں نے طعن کا انداز ایسا اختیار کیا کہ اس امت کے سادہ لوح علماء بھی ایسی باتوں کے شکار ہوگئے اور انہوں نے اپنی تصنیفات میں ایسی بیہودہ باتوں کو جگہ دے دی۔ اللہ تعالیٰ جزاءِ خیر دیدے اس امت کے محققین اور نقاد علماء کرام کو جنہوں نے دین کی حفاظت میں اپنے رات دن لگا دیئے، حقیقت یہ ہے کہ ختم نبوت کی وجہ سے اس امت میں ایسے محقق اور نقاد علماء پیدا ہونے ہی ہیں اگر یہ پیدا نہ ہوتے تو سابقہ شریعتوں کی طرح یہ شریعت بھی کب کو اپنی حقیقت کھو بیٹھی۔

مجھے عرصہ دراز سے یہ فکر رہتی تھی کہ انبیاء علیہم السلام کی طرف منسوب ایسے غلط اور بیہودہ قصوں کا رد لکھنا چاہئے اور قرآن کی ان آیات کا صحیح تفسیر لکھنا چاہئے اور ان مضامین اور تحقیق کو یکجا کرکے ایک کتابچہ کی صورت میں لانا چاہئے تاکہ خواص اور عوام کو بھی تحقیق ملنے میں آسانی ہو جائے۔ اتفاق سے ایک مرتبہ ”عصمت انبیاء“ کے نام سے کتاب نظر آئی، میں نے سوچا اب اس عنوان پر کتاب لکھنا فضول ہے کیونکہ کام ہو چکا ہے لیکن جب دیکھا تو محسوس ہوا کہ اس کا انداز فلسفیانہ ہے عوام تو اس سے فائدہ حاصل نہ کرسکیں گے لہذا میں نے اس کتاب کو بھی اپنے رہنما کتابوں میں شامل کر دیا اور عام فہم انداز میں لکھنا شروع کر دیا۔ انبیاء علیہم السلام پر اعتراضات اور شبہات کو ابحاث کا نام دیا اور ان کے جوابات کو وضاحت کے نام سے لکھا کیونکہ انبیاء علیہم السلام جیسے مقدس ہستیوں پر اعتراضات اور شبہات کا نام دینا طبیعت گوارہ نہیں کرتی تھی، ایسے الفاظ مجھے نامناسب نظر آئے۔

مجھے اپنی بے بضاعتی پر اعتراف ہے، مجھے کیا علم ہے! میں تو صرف علماء کرام کی خاکپاء ہوں اور انکی تحقیق نقل کرنے والا ہوں۔ پھر بھی غلطی سے بچنے کے لئے مفسر قرآن شیخ الحدیث پیر طریقت حضرت مفتی عبدالوہاب صاحب مدیر دارالعلوم شرعیہ

Marfat.com

روہڑی ضلع سکھر سے عرض کیا کہ حضرت میں نے دل کے جذبہ سے نوک قلم کو حرکت دیکر اس مواد کو جمع کیا ہے آپ مہربانی فرماکر نظر ثانی کر دیں، میں حضرت کا تہ دل سے ممنون و مشکور ہوں انہوں نے اپنی گوناگون مصروفیات سے وقت نکال کر نہ صرف نظر ثانی کی بلکہ مفید مشورے بھی دیے اور اصلاح بھی فرمائی۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے انہیں جزاء خیر دے۔

اللہ رب العزت کے حضور میں دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس کتابچہ کو قبول فرمائے۔

میری مثال اس بوڑھی کی سی ہے جو خریداران یوسف میں شامل ہونا چاہتی تھی۔ ورنہ میں کیا ہوتا ہوں کہ آیات قرآن کا تفسیر لکھوں یا انبیاء علیہم السلام کے متعلق کچھ لکھ سکوں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ قرآن کریم کی خدمت کرنے والوں میں اس بوڑھی کی طرح اپنا نام لکھوالوں۔ اللہ ذوالمنۃ والاحسان کے حضور میں دست بدعا ہوں کہ اپنے فضل و کرم سے اس تھوڑی سے محنت کو قبول فرمائے۔ ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ و قنا عذاب النار یا عزیز یا غفار یا رب العالمین وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا محمد والہ وصحبہ وبارک وسلم۔

ابو اللیث غلام محمد میمن
فاضل مظہر العلوم کھڈہ کراچی۔
ساکن پریالوء
مہتمم مدرسہ مفتاح العلوم حمادیہ
فیض واہ، ضلع خیرپور میرس سندھ

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریظ: پیر طریقت شیخ التفسیر والحدیث
حضرت مولانا مفتی عبد الوہاب صاحب زید مجدہٗ

نحمدہ اللہ العظیم ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

اما بعد یہ فتنوں کا دور ہے یہ وہی دور ہے جو حضرت رسول اللہ ﷺ کو دکھایا گیا تھا جس میں فتنے بارش کی طرح برس رہے تھے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی فتنہ نمودار ہو رہا ہوتا ہے، جسکے سدباب کیلئے اور اسکے تعاقب میں ربانی علماء کو مساعی کرنی پڑتی ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی عصمت کا مسئلہ نہ صرف اسلامی مسلمات میں شامل ہے بلکہ شریعت مطہرہ کے لازم العمل ہونے کا مدار بھی اس پر ہے۔ اگر نبی سے گناہ صادر ہونے کا امکان ہوتا تو انبیاء علیہم السلام کا کوئی بھی فعل شریعت ہونے کے قابل نہ رہتا بلکہ نبی کے فعل کے اندر گناہ ہونے کا امکان اسکے شریعت بننے میں رکاوٹ ہوتا۔

ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کیلئے امامت یعنی نبوت کا سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تیری ساری اولاد اس قابل نہیں ہوگی کیونکہ لاینال عھدی الظالمین یعنی میرا یہ عہد (نبوت) گنہگاروں کو حاصل نہ ہوگا۔

بہرحال انبیاء علیہم السلام کی معصومیت فرضی عقائد میں شامل ہے۔ اس عقیدہ کا اپنانا امت کے ہر فرد کیلئے فرض اور ضروری ہے۔ خاتم الفقہاء حضرت مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی نے اسلامی فرائض پر ایک کتاب لکھی ہے فرائض الاسلام (عربی) جو کئی بار طبع ہو چکی ہے۔

ترجمہ: (۲۱) انبیاء علیہم السلام چار گناہوں کفر، کذب، خیانت اور وعدہ خلافی سے معصوم ہیں اس پر پوری امت کا اجماع ہے قلیل ہو یا کثیر، نبوت سے پہلے ہو یا نبوت کے بعد۔ ان چار

Marfat.com

گناہوں کے علاوہ دوسرے گناہوں کے بارے میں کچھ اختلاف ہے لیکن (اہل سنت و جماعت کے ہاں) صحیح یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام ہر قسم کے گناہوں سے معصوم ہیں بڑے گناہ ہوں یا چھوٹے، ارادے سے ہوں یا سہو یا غلطی میں، نبوت ملنے سے پہلے ہوں یا بعد میں، تندرستی میں ہوں یا بیماری میں، عام حالت میں ہوں یا غصہ میں۔

(۲۲) "انبیاء علیہم السلام سہو و نسیان اور تبلیغی امور میں غلطی سے معصوم ہیں وحی کے سننے کے وقت اور لوگوں کو اسکے سنانے اور پہنچانے کے وقت بھی معصوم ہیں۔"

خلاصہ یہ ہے کہ اہل سنت و جماعت کے ہاں عصمت انبیاء میں دو قول نہیں۔ اگر کسی کا قول ہے تو بھی وہ مسترد ہے۔

عصمت انبیاء میں تردد کرنے والے گمراہ ہیں اور وہ متشابہات میں غلط تاویلات کے مرتکب ہوتے ہیں اور محکم آیات پر چلنے سے قاصر ہیں۔ سورۃ آل عمران کی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ قرآن مجید کی آیات دو قسم کی ہیں محکمات اور متشابہات۔ محکمات اصل ہیں اور متشابہات (جن کی کئی معانی ہو سکتی ہیں) کی معنی میں محکم کو مد نظر رکھا جائیگا۔ گمراہ لوگ محکم کو چھوڑ کر متشابہ کے پیچھے پڑتے ہیں۔

خلاصہ: صحابہ کرام ان لوگوں کو سزائیں دیتے تھے جو متشابہ کے پیچھے ہوتے تھے، سنن دارمی میں ہے کہ "سلیمان بن یسارؒ نے فرمایا کہ مدینہ منورہ میں ایک آدمی آیا جس کا نام صبیغ تھا وہ متشابہات کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسکو بلایا اور کھجور کی چھڑیاں بھی اپنے پاس رکھیں، اسکو اتنا مارا کہ اسکا سر خون آلود ہو گیا، پھر اسکو چھوڑا جب اس کے زخم ٹھیک ہو گئے تو دوبارہ اسکو بلایا پھر اسکو مارا کہ اس کا سر خون آلود ہو گیا پھر اسکو چھوڑا جب ٹھیک ہو گیا تو تیسری بار اسکو بلایا جب صبیغ نے چھڑیاں دیکھیں تو وہ گھبرا گیا اور اس نے امیر المومنین سیدنا عمرؓ سے کہا اگر مارنا ہے تو ایک ہی بار مار دو۔ حضرت عمرؓ نے اسکو اپنے علاقے یمن بھیج دیا اور وہاں کے گورنر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو لکھا کہ "اسکے پاس کسی بھی مسلمان کو بیٹھنے نہ دو۔" بعد میں وہ خارجی خیالات کا ہو گیا تھا۔ (حیلۃ طالب العلم)

انبیاء علیہم السلام کے متعلق کچھ آیات متشابہات ہیں جن کو محکم آیات مثلاً لاینال عھدی الظالمین کے تناظر میں دیکھنا لازم ہے۔ ایسی متشابہ آیات سے محکم کی طرف رجوع کئے بغیر

Marfat.com

من مانی معانی لینا گمراہی ہے، کچھ لوگ من پسند مطالب لیکر گمراہی کی اشاعت کر رہے ہیں۔

یہود و نصاریٰ نے موجودہ بائبل میں انبیاء کو سخت گنہگار ہونے کا ذکر کیا ہے۔ یعقوب علیہ السلام کو اپنی بہو سے بدکاری کرتے ہوئے، شعیب علیہ السلام کو اپنی سب بیٹیوں سے زنا کرتے ہوئے اور داؤد علیہ السلام کو بت سبیل عورت کو غسل کرتے ہوئے اوپر سے ننگا دیکھ کر اپنے محل میں بلوا کر زنا کرتے ہوئے دکھایا ہے۔ العیاذ باللہ سبحانك هٰذا بهتان عظیم۔ یہود و نصاریٰ کے ربیوں اور پادریوں کا اس میں اپنا مطلب تھا، اپنی بدکرداری کو خفیف بنانا تھا کہ جب انبیاء علیہم السلام نے اپنی بہو اور بیٹیوں سے زنا کی ہے تو ہم کس باغ کی مولی ہیں۔ یہ گمراہ لوگ بھی یہود و نصاریٰ کی پیروی میں انبیاء علیہم السلام کے متعلق غلط فہمی پیدا کر کے شریعت کو مطعون کر رہے ہیں۔

کچھ لوگ عصمت کو انبیاء سے اختصاص کا انکار کر کے اہل بیت میں بھی عصمت کے قائل ہوئے ہیں دونوں فریق افراط و تفریط میں مبتلا ہو کر گمراہ ہوئے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں اور صحابہ کرام اہل بیت سے ہوں یا دوسرے قبائل سے وہ محفوظ ہیں۔

بہرحال متشابہ آیات کی غلط تاویلات کی بنیاد پر جو لوگ عصمت انبیاء کے بارے میں گمراہ ہوئے ہیں انہوں نے عام لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے کتابیں لکھی ہیں جن کے جوابات کئی علماء کرام نے دئے ہیں۔ حضرت مولانا غلام محمد میمن صاحب نے بھی ”انبیاء کی معصومیت“ کے عنوان سے کافی وشافی کتاب لکھی ہے، میں نے اسکو اول سے آخر تک پڑھا ہے اور مشورے بھی دیئے ہیں جن کو مصنف علامہ نے قبول بھی فرمایا۔ یہ کتاب آسان اور عام فہم انداز میں لکھی گئی ہے، میرے خیال میں یہ کتاب اس موضوع پر بہترین کتاب ہے جو کہ نرالے انداز میں لکھی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس عمدہ کتاب کو قبولیت عامہ اور افادات تامہ نصیب فرمائے اور اپنی دربار میں قبولیت کا شرف بخشے!! آمین یارب العالمین۔

عبدالوہاب چاچڑ

خادم شریعت

۴ رمضان المبارک ۱۴۳۴ھ

Marfat.com

مقدمہ

عصمت انبیاء علیہم السلام کے متعلق

انبیاء علیہم السلام کی عصمت کا مسئلہ نہایت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ مخلوق کا خالق سے مملوک کا مہربان مالک سے بندہ کا اپنے معبود سے تعلقات استوار کرانے والے یہ انبیاء علیہم السلام ہی ہیں باطل کی کوششیں تو یہی رہی ہیں کہ ان اساسی شخصیتوں کو ایسا مطعون کیا جائے کہ دین اسلام کی روشنی بجھ جائے، لیکن ایسا ہو نہیں سکتا، یہ نور بجھنے والا نہیں ہے۔

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ

(سورۃ صف: ۸)

یہ (کافر) چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور (روشنی) کو اپنے منہ سے بجھادیں (لیکن) اللہ تعالیٰ اپنے نور (دین حق) کو پورا کریگا گرچہ کافر لوگ ناپسند کریں۔

اللہ رب العزت نے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو چنا تو انسانیت میں سے ہے، لیکن ان کا تعلق خصوص اپنی ذات سے ایسا جوڑ کر رکھا کہ کبھی بھی کسی بکواس کرنے والے کیلئے کوئی راستہ باقی نہ رہے۔ باطل نے لاکھ کوشش کی ہے کہ انبیاء علیہم السلام لگائے گئے طعنوں سے مبرا نہ ہو سکیں، لیکن اللہ رب العزۃ نے اپنے فضل و کرم سے حفاظت قرآن اور انبیاء علیہم السلام کی معصومیت کو قرآن وحدیث کی روشنی میں ثابت کرنے جیسا کام جو اس امت سے لیا، اس کی نظیر سابقہ امم میں ہرگز نہیں ملتی۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے کائنات کیلئے اور انسانیت کیلئے مقتدا اور رہنما بنا کر بھیجا ہو وہ خود اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اللہ کی مرضی کے خلاف امور

Marfat.com

سرانجام دینے بیٹھ جائیں انبیاء علیہم السلام اس طرح صغائر یا کبائر کے مرتکب ہوں تو پھر ان کے اقوال و افعال سے اعتماد اُٹھ جائے گا اور جب انبیاء علیہم السلام قابلِ اعتماد و اطمینان نہ رہے تو دین کیسے قابلِ اعتماد و قابل عمل رہے گا۔

رہی بات یہ کہ بعض آیات قرآن کریم سے متعدد انبیاء علیہم السلام کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ ان سے گناہ سرزد ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر عتاب بھی نازل ہوا ہے۔ تو اس مسئلہ میں لوگ مختلف آراء میں بٹ گئے ہیں یہاں تک کہ بعضوں نے انبیاء علیہم السلام کے متعلق کبائر و صغائر کے ارتکاب اور کفر و ضلال تک کو کہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی پیغمبر نے جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی انحرافی نہیں کی، وہ یا تو اجتہادی غلطی ہوتی ہے یا نسیان وغیرہ وہ عمل شریعت کی اصطلاح میں گناہ کے زمرے میں نہیں آتا اور خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے پیچھے شفقت ورافت کا معاملہ ہوتا ہے جیسے آپ ان آیات کی وضاحت میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

اس موضوع پر حضرت علامہ امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک لمبی فصل قائم کی ہے جس سے ہم کچھ اقتباس کرتے ہیں لیکن اس سے پہلے قصص القرآن سے حضرت علامہ حفظ الرحمان سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ کی چند سطور کو پیش کرتے ہیں۔

عصمت نبی کے معنی: خالق کائنات نے انسان کی تخلیق متضاد قوتوں کے ساتھ فرمائی ہے یعنی اس کو نیک و بد دونوں قسم کی قوتیں عطا کی گئی ہیں، وہ گناہ بھی کر سکتا ہے اور نیکی بھی وہ ارادہ بد کا بھی حامل ہے اور ارادہ خیر کا بھی، اور یہی اسکے انسانی شرف کا طغرائے امتیاز ہے۔

ان متضاد قوتوں کے حامل "انسان" میں سے حضرت حق تعالیٰ انسانی رشد و ہدایت اور وصول الی اللہ کے لئے کبھی کبھی کسی شخص کو چن لیتے اور اسکو اپنا رسول نبی اور پیغمبر بنا لیتے ہیں اور اس سلسلہ کی آخری کڑی ذات اقدس محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اور جب یہ ہستی "نبوت" کیلئے چن لی جاتی ہیں تو اسکے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ عمل و ارادہ کی زندگی میں ہر قسم کے گناہ سے پاک، اور ہر قسم کی نافرمانیوں سے منزہ ہو، تاکہ پیغامِ الٰہی کے منصب میں خدا کی صحیح نیابت ادا کر سکے اور:

Marfat.com

"خویشتن گم است کہ راہبری کند" کا مصداق نہ ثابت ہو اس طرح وہ ایک انسان اور بشر بھی ہے، کھاتا ہے، پیتا ہے، سوتا ہے اور اہل و عیال کی زندگی سے بھی وابستہ ہے اور ہر قسم کی عملی ارادہ گناہ سے پاک بھی ہے کیونکہ وہ ہر قسم کی نیکی کیلئے ہادی و مرشد اور خدا کا نائب ہے، اگرچہ وہ دوسرے انسانوں کی طرح متضاد قوتوں کا حامل ضرور ہے لیکن عمل اور ارادہ میں اس سے ہر قسم کی بدی کے ظہور کو ناممکن اور محال کر دیا گیا ہے تاکہ اس کا ہر ایک ارادہ اور ہر ایک عمل اور ہر ایک قول، غرض ہر ایک حرکت و سکون، کائنات کیلئے اسوہ اور نمونہ بن سکے۔ البتہ بشریت و انسانیت سے متصف ہونے کی بنا پر سہو، نسیان اور لغزش کا امکان باقی رہتا ہے اور کبھی کبھی عملی شکل بھی اختیار کرلیتا ہے مگر فوراً ہی اس پر متنبہ کیا جاتا ہے اور وہ اس سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔

سہو اور نسیان تو اپنے مفہوم میں ظاہر ہے مگر زلۃ (لغزش) کیا ہے؟ تو اس کا اطلاق ایسی حقیقت پر ہوتا ہے کہ جہاں نہ عمل اور کردار میں تمرد اور سرکشی کا دخل ہو اور نہ قصد و ارادہ کے ساتھ حکم کی خلاف ورزی کا۔ اور ساتھ ہی وہ عمل اپنی حقیقت کے اعتبار سے قبیح، بد اور شر بھی نہ ہو بلکہ ان تمام امور کے پیشِ نظر وہ اپنی ذات میں اگرچہ اباحت اور جواز کا درجہ رکھتا ہو، مگر کرنے والے کی ہستی کے شایانِ شان نہ ہو بلکہ اس کے عظیم رُتبہ کے سامنے سبک اور ہلکا نظر آتا ہو، بااین ہمہ اسلئے عمل میں آگیا کہ عمل کرنے والے کی نگاہ میں اسکا اس طرح کرنا خدائے تعالیٰ کی مرضی کے خلاف نہ تھا، لیکن نبی پر چونکہ خدائے تعالیٰ کی مستقل حفاظت و نگرانی رہتی ہے اسلئے فوراً ہی اس کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ یہ عمل تمہاری جلالت قدر اور عظمت مرتبہ کے شایانِ شان نہیں ہے اور قطعی غیر مناسب ہے اسی فرق مراتب کو عربی کی اس مثل میں ظاہر کیا گیا ہے۔ (حسنات الابرار سیئات المقربین)

نکوکار انسانوں کی عام خوبیاں مقربین بارگاہِ الٰہی کے حق میں برائیاں ہوتی ہیں۔

مگر اسلئے کہ ایک مقرب بارگاہ الٰہی کو خدا کی مرضی کے سمجھنے میں بھی یہ لغزش کیوں پیش آئی۔ سنۃ اللہ یہ جاری ہے کہ وہ انبیاء و مرسلین (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کی

Marfat.com

اس قسم کی لغزشوں پر جب انکو متنبہ کرتا ہے تو اول نہایت سخت اور مجرمانہ عمل کی حیثیت میں اس لغزش کا ذکر کرتا ہے مگر پھر کسی دوسرے مقام پر اس معاملہ کی اصل حقیقت کو ظاہر کرکے "نبی ورسول" کے عمل کو لغزش کی ہی حد میں لے آتا ہے اور ان کی جانب سے خود ہی معذرت کر دیتا ہے تاکہ کسی ملحد اور زندیق کو کسی بھی نبی و رسول کی جانب گناہ کے الزام لگانے کی جرأت نہ ہو سکے۔

علامہ ابوالفضل قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "الشفا" میں لکھتے ہیں:

زَلّاتُ الانبیاء فی الظاھِرِ زَلّاتٌ فی الحقیقة کراماتٌ

یعنی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی لغزشیں ظاہر میں لغزشیں ہوا کرتی ہیں لیکن درحقیقت ان میں بھی انبیاء علیہم السلام کیلئے عزت ہے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ عصمت انبیاء علیہم السلام پر اس طرح دلائل پیش کرتے ہیں۔

پہلی دلیل: اگر انبیاء علیہم السلام سے گناہ صادر ہوں تو پھر امت کے عام گنہگاروں کی بہ نسبت انبیاء علیہم السلام دنیا میں مذمت اور آخرت میں عذاب کے زیادہ مستحق ہوں گے اور یہ باطل ہے تو پھر ان سے گناہ کا صدور بھی باطل ہے۔

ملازمہ: وجہ اس کی یہ ہے کہ بندوں کو حق تعالیٰ نے جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں ان میں سب سے بڑی نعمت نبوت اور رسالت ہے اور جسے حق تعالیٰ نے نعمتیں زیادہ دی ہوں اس کا نافرمانی کرنا بہت گھناؤنا ہے، اس پر صریح عقل کے دلالت کرنے کے ساتھ ساتھ نقل بھی تین طریقوں سے اس کی تائید کرتی ہے۔

۱- حق تعالیٰ کا ازواجِ مطہرات کو ارشاد ہے:

یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ (احزاب:۳۲)

ترجمہ: اے نبی کی بیویو! تم معمولی عورتوں کی طرح نہیں ہوں۔

اور ارشاد ہے:

یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ مَنْ یَّاْتِ مِنْکُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ یُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَیْنِ ؕ وَ کَانَ ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرًا (احزاب:۳۰)

ترجمہ: "اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو کھلی ہوئی بدکاری کرے تو اسے دوگنا

Marfat.com

عذاب دیا جائے گا۔"
۲۔ محصن (شادی شدہ) کو سنگسار اور غیر محصن (غیر شادی شدہ) کو کوڑے لگائے جاتے ہیں۔
۳۔ غلام پر آزاد کی بہ نسبت آدھی حد جاری کی جاتی ہے۔
لہٰذا ان تینوں دلائل سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اگر انبیاء علیہم السلام سے گناہ صادر ہوں تو پھر وہ امت کے عام گنہگاروں کی بہ نسبت دنیا میں زیادہ مذمت اور آخرت میں زیادہ عذاب کے مستحق ہوں گے، جبکہ یہ بالاجماع باطل ہے اسلئے کہ کوئی بھی یہ کہنا گوارا نہیں کرتا کہ پیغمبر، اللہ کے نزدیک تو سب سے اچھی حالت کا حامل ہو اور رتبہ میں ہر ایک سے کمتر ہو۔
یہ انبیاء علیہم السلام سے گناہ سرزد نہ ہونے کی پہلی دلیل ہے۔
دوسری دلیل: اگر انبیاء علیہم السلام سے گناہ صادر ہو تو پھر ان کی گواہی قابل قبول نہ ہوتی اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا (سورۃ حجرات: ۶)

ترجمہ: "اے ایمان والو اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی سی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کیا کرو۔"

اس آیت میں فاسق کے قول کی تحقیق اور اس کی گواہی قبول ہونے سے توقف کا حکم دیا گیا ہے جبکہ انبیاء علیہم السلام کا مردود الشہادۃ ہونا باطل ہے اسلئے کہ جس کی گواہی دنیاوی معاملات میں معتبر نہ ہو تو ان کی گواہی کو کیسے قبول کیا جائے گا ان ادیان کے بارے میں جو قیامت تک باقی رہیں گے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ نبی علیہ السلام قیامت کے دن اپنی امت کیلئے گواہی دیں گے اور یہ امت پہلی امتوں پر گواہی دیں گیں ارشاد باری ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ
وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (بقرہ: ۱۴۳)

ترجمہ: "اور اسی طرح ہم نے تمہیں برگزیدہ بنایا تاکہ تم اور لوگوں پر گواہ ہو

Marfat.com

اور رسول تم پر گواہ۔"

اور جو قیامت کے دن سارے انبیاء علیہم السلام کیلئے گواہ ہوں گے تو ان کی گواہی جنت کے بارے میں کیسے قابل قبول نہ ہو گی۔

تیسری دلیل: اگر انبیاء علیہم السلام سے گناہ صادر ہوں تو پھر انہیں تنبیہ کرنا ضروری ہوتا۔ اسلئے کہ دلائل نیکیوں کے حکم کرنے اور برائیوں سے روکنے کے وجوب پر دلالت کرتے ہیں، جبکہ انبیاء علیہم السلام کو زجر و توبیخ کرنا حرام ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِیْنًا

(الاحزاب:۵۷)

ترجمہ: "جو لوگ اللہ اور اسکے رسول کو ایذا پہنچاتے ہیں ان پر اللہ تعالیٰ نے دنیا و آخرت میں لعنت کی ہے۔"

پس انبیاء علیہم السلام سے گناہ کا صادر ہونا ممتنع ہوا۔

چوتھی دلیل: اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فسق صادر ہو تو یا ہمیں اس فسق میں ان کی پیروی کا حکم ہو گا اور یہ جائز نہیں، اور یا ان کی اتباع کا حکم نہ ہو گا اور یہ بھی باطل ہے اسلئے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (آل عمران:۳۱)

ترجمہ: "کہدو اگر تم اللہ کی محبت رکھتے ہو تو میری تابعداری کرو تا کہ اللہ تم سے محبت کرے۔"

اور جب یہ دو باطل قسمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فسق سرزد ہونے کی صورت میں جنم لیتی ہیں تو ان سے فسق کا سرزد ہونا ہی محال ہو گا۔

پانچویں دلیل: اگر انبیاء علیہم السلام سے گناہ صادر ہوں تو پھر وہ ضرور جہنم کی وعیدات کے مستحق ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ مَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ یَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ یُدْخِلْهُ نَارًا

Marfat.com

خَالِدًا فِيهَا وَلَهُ عَذَابٌ مُّهِينٌ (النساء:۱۴)

ترجمہ: ”اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اور اس کی حدوں سے نکل جائے اللہ تعالیٰ اسے آگ میں ڈالیں گے یہ اس میں ہمیشہ رہیگا اور اس کیلئے ذلت کا عذاب ہے۔“

اور ملعون ہوں گے:

أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ (ھود:۱۸)

ترجمہ: ”خبردار! ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔“

حالانکہ باجماع امت یہ باطل ہے تو انبیاء علیہم السلام سے گناہ کا سرزد ہونا بھی باطل ہے۔

چھٹی دلیل: انبیاء علیہم السلام نیکی کرنے اور بدی چھوڑنے کا حکم دیتے تھے، پس اگر وہ نیکی چھوڑدیتے اور گناہ کا ارتکاب کرتے تو ضرور حق تعالیٰ کے اس ارشاد کے تحت آجاتے۔

ارشاد ربانی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ (الصف:۲،۳)

ترجمہ: ’اے ایمان والوں! کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں اللہ کے نزدیک بڑی ناپسند بات ہے جو کہو اس کو کرو نہیں۔“

اور زجز و توبیخ کے بھی مستحق ہوں گے:

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (البقرہ:۴۴)

ترجمہ: ”کیا لوگوں کو تم نیکی کا حکم کرتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو، حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو پھر کیوں نہیں سمجھتے۔“

اور ظاہر ہے کہ یہ طرز عمل انتہائی قبیح ہے انبیاء علیہم السلام اس سے پاک ہیں۔ جیسا کہ اس طرز عمل سے حضرت شعیب علیہ السلام نے یوں برات کا اعلان کیا ہے:

Marfat.com

وَمَآ اُرِیْدُ اَنْ اُخَالِفَکُمْ اِلٰی مَآ اَنْھٰکُمْ عَنْهُ (سورہ ہود: ۸۸)

ترجمہ: "اور میں یہ نہیں چاہتا کہ جس کام سے تمہیں منع کروں اس کے خلاف کروں۔"

ساتویں دلیل: اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحاق و یعقوب علیہم السلام کی صفت میں فرماتے ہیں:

اِنَّھُمْ کَانُوْا یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ وَیَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَھَبًا (الانبیاء: ۹۰)

ترجمہ: "بیشک یہ لوگ نیک کاموں میں دوڑ پڑتے تھے۔"

الخیرات میں الف لام جمع پر داخل ہو کر عموم کا فائدہ دے رہا ہے لہٰذا لفظ الخیرات ہر جائز و مناسب فعل کے کرنے اور ناجائز و نامناسب فعل کے چھوڑنے کو شامل ہوگا اور یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ انبیاء علیہم السلام ہر نیکی کو کرنے اور ہر برائی کو چھوڑنے والے تھے اور یہی ہمارا مدعی ہے۔

آٹھویں دلیل: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِنَّھُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَیْنَ الْاَخْیَارِ (ص: ۴۷)

ترجمہ: "بیشک وہ ہمارے نزدیک برگزیدہ نیک بندوں میں سے تھے۔"

اس آیت میں یہ دونوں لفظ "المصطفین الاخیار" ساری نیکیاں کرنے اور برائیاں چھوڑنے کو شامل ہیں۔ اسلئے کہ اس جیسے لفظ سے استثناء کرنا جائز ہے، جیسا کہ عرب کہتے ہیں، فلان من المصطفین الاخیار الا فی کذا، اور استثناء کی حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر حرف استثناء نہ آتا تو مستثنیٰ ضرور مستثنیٰ منہ میں داخل ہوتا۔ پس یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام زندگی کے ہر شعبے میں برگزیدہ و چنیدہ ہی ہوا کرتے تھے اور صرف یہ نہیں بلکہ اس قسم کے بلند و بالا تعریفی کلمات قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام کے لئے جابجا استعمال کیے گئے ہیں۔

(۱) ارشادِ ربانی ہے:

اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ (حج: ۷۵)

ترجمہ: "فرشتوں اور آدمیوں میں سے اللہ ہی پیغام پہنچانے کیلئے چن لیتا ہے۔"

۱۴۱۷۳۵

Marfat.com

(۲) اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰۤی اٰدَمَ وَ نُوۡحًا وَّ اٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ

(آل عمران:۳۳)

ترجمہ: "بیشک اللہ نے آدم کو اور نوح کو اور ابراہیم کی اولاد کو اور عمران کی اولاد کو سارے جہاں سے پسند کیا ہے۔"

(۳) اور ابراہیم علیہ السلام کے حق میں فرمایا گیا:

وَ لَقَدِ اصۡطَفَیۡنٰہُ فِی الدُّنۡیَا ۚ وَ اِنَّہٗ فِی الۡاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۱۳۰﴾ (البقرۃ:۱۳۰)

ترجمہ: "اور ہم نے تو اسے دنیا میں بھی بزرگی دی تھی بیشک وہ آخرت میں بھی اچھے لوگوں میں سے ہو گا۔"

(۴) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے:

قَالَ یٰمُوۡسٰۤی اِنِّی اصۡطَفَیۡتُکَ عَلَی النَّاسِ بِرِسٰلٰتِیۡ وَ بِکَلَامِیۡ ۫ۖ (اعراف:۱۴۴)

ترجمہ: "اے موسیٰ میں نے پیغمبری اور ہم کلامی سے دوسرے لوگوں پر تجھے امتیاز دیا ہے۔"

(۵) وَ اذۡکُرۡ عِبٰدَنَاۤ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اِسۡحٰقَ وَ یَعۡقُوۡبَ اُولِی الۡاَیۡدِیۡ وَ الۡاَبۡصَارِ

اِنَّاۤ اَخۡلَصۡنٰہُمۡ بِخَالِصَۃٍ ذِکۡرَی الدَّارِ (ص:۴۶،۴۵)

ترجمہ: "اور ہمارے بندوں ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب (علیہم السلام) کو یاد کر جو ہاتھوں اور آنکھوں والے تھے بیشک ہم نے انہیں ایک خاص فضیلت دی یعنی ذکرِ آخرت کیلئے چن لیا تھا۔"

اعتراض: اصطفاء کی صفت سے متصف ہونا گناہ سے مانع نہیں ہے، سورہ فاطر میں ہے۔

ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡکِتٰبَ الَّذِیۡنَ اصۡطَفَیۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا ۚ فَمِنۡہُمۡ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِہٖ ۚ وَ مِنۡہُمۡ مُّقۡتَصِدٌ ۚ وَ مِنۡہُمۡ سَابِقٌۢ بِالۡخَیۡرٰتِ بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَضۡلُ الۡکَبِیۡرُ (فاطر:۳۲)

ترجمہ: "پھر ہم نے اپنی کتاب کا ان کو وارث بنایا جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے چن لیا پس بعض ان میں سے اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض ان میں سے میانہ رو ہیں اور بعض ان میں سے اللہ کے حکم سے نیکیوں

Marfat.com

میں پیش قدمی کرنے والے ہیں۔"

پس اس آیت میں مصطفین (برگزیدہ) لوگوں کی تین قسمیں بیان کی گئیں:
ا۔ ظالم ۲۔ مقتصد ۳۔ سابق بالخیرات۔ جبکہ ظالم کا ظلم تو بدترین گناہ ہے۔

جواب: فمنھم کے اندر ضمیر عبادنا کی طرف لوٹ رہی ہے۔
الذین اصطفینا کی طرف نہیں اسلئے کہ نحوی گرامر کے مطابق ضمیر کو مرجع قریب کی طرف لوٹانا واجب ہوتا ہے۔

نویں دلیل: سورہ "ص" میں اللہ تعالیٰ شیطان کی قسم کی حکایت کرتے ہیں:
قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ (ص:۸۳،۸۲)

ترجمہ: "عرض کی کہ تیری عزت کی قسم!! میں ان سب کو گمراہ کردوں گا، مگر ان میں جو تیرے خالص بندے ہوں گے۔"

تو اس آیت میں ابلیس نے مخلصین ہی کو اپنے اضلال اور اغواء سے مستثنیٰ قرار دیا اور کامل مخلص انبیاء علیہم السلام ہی ہوتے ہیں چنانچہ ابراہیم و اسحاق و یعقوب علیہم السلام کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ "انا اخلصناھم بخالصۃ" اور یوسف علیہ السلام کے حق میں ارشاد ہے: انہ من عبادنا المخلصین۔ ابلیس کا یہ اقرار کہ میرے گمراہ کن حربوں سے مخلصین ہی بچ سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی یہ گواہی کہ انبیاء علیہم السلام مخلصین میں سے ہیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی ہے کہ ابلیس کی گمراہ کن تدابیر اور دلفریب وساوس سے انبیاء علیہم السلام محفوظ ہو کر چلے گئے تھے، اور اس سے یہ بات یقینی طور پر سامنے آتی ہے کہ ان سے کوئی بھی گناہ سرزد نہیں ہوا تھا۔

دسویں دلیل: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ إِبْلِيسُ ظَنَّهُ فَاتَّبَعُوهُ إِلَّا فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ (سورہ سبا:۲۰)

ترجمہ: "اور البتہ شیطان نے ان پر اپنا گمان سچ کر دکھایا سوائے ایمانداروں کے ایک گروہ کے سب اس کے تابع ہو گئے۔"

اس آیت کریمہ میں اتباع ابلیس سے بچنے والے گروہ کے متعلق یہی کہا جائے گا کہ وہ انبیاء تھے اسلئے کہ اگر یہ انبیاء کے گروہ نہ ہو تو یہ لوگ انبیاء سے افضل ٹھہرے،

Marfat.com

جیسا کہ ارشاد ہے:

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ (حجرات:۱۳)

ترجمہ: ”بیشک زیادہ عزت والا تم میں سے اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیز گار ہے۔“

اور یہ بالا جماع باطل ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام سے کوئی بھی افضل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ جس جماعت نے ابلیس کی اتباع نہیں کی وہ انبیاء علیہم السلام کی ہی جماعت تھی اور جو ابلیس کی اتباع کرے گا وہ گناہگار ہو گا پس یہ دلیل ہے اس پر کہ انبیاء علیہم السلام نے کسی قسم کے گناہ کا ارتکاب نہیں کیا۔

گیارھویں دلیل: اللہ تعالیٰ نے مکلفین کو دو گروہ میں تقسیم کیا ہے:

(۱) حزب الشیطان (شیطان کی جماعت) جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے۔

اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (المجادلہ: ۱۹)

ترجمہ: ”یہی شیطان کا گروہ ہے خبردار بیشک شیطان کا گروہ ہی نقصان اٹھانے والا ہے۔“

(۲) حزب اللہ (اللہ کی جماعت) جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (المجادلہ:۲۲)

ترجمہ: ”یہی اللہ کا گروہ ہے خبردار بیشک اللہ کا گروہ ہی کامیاب ہونے والا ہے۔“

اور بلاشبہ شیطانی گروہ تو وہی ہو گا جو شیطان کی چاہت اور اس کی مرضی کے مطابق چلے گا، پس اگر انبیاء علیہم السلام سے شیطانی عمل سرزد ہو جائے تو وہ بھی (نعوذ باللہ) شیطان کے گروہ میں شمار ہوں گے اور ان پر یہ آیت کریمہ صادق ہو گی الا ان حزب الشیطان ہُمُ الخاسرون۔ اور امت کے نیک عمل لوگوں پر یہ آیت صادق ہو گی، (الا ان حزب اللہ ھم الفلحون) اور اس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ امت کے بعض افراد انبیاء علیہم السلام سے افضل و بہترین ہیں جبکہ یہ نتیجہ صریح البطلان ہے۔

بارھویں دلیل: ہمارے اصحاب یہ کہتے ہیں (اللہ ان پر رحم کرے) کہ انبیاء علیہم السلام فرشتوں سے بہترین ہیں اور یہ حقیقت دلائل سے ثابت ہے کہ فرشتوں نے کسی

Marfat.com

قسم کے گناہ کا ارتکاب نہیں کیا۔ پس اگر انبیاء علیہم السلام سے گناہ صادر ہونا تسلیم کیا جائے تو فرشتوں سے ان کا افضل ہونا ممتنع ہوگا، اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِیْنَ فِی الْاَرْضِ ز

اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ كَالْفُجَّارِ (ص:۲۸)

ترجمہ: "کیا ہم کر دیں گے ان کو جو ایمان لائے اور نیک کام کئے ان کی طرح جو زمین میں فساد کرتے ہیں، یا ہم پرہیز گاروں کو بدکاروں کی طرح کر دیں گے۔"

تیرھویں دلیل: اللہ تعالیٰ ابراہم علیہ السلام کے حق میں فرماتے ہیں:

قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ط (بقرہ:۱۲۴)

ترجمہ: "بیشک میں تجھے لوگوں کا پیشوا بنادوں گا۔"

اور پیشوا وہی ہوتا ہے جس کی اقتدا کی جاتی ہے۔ پس اگر ابراہیم علیہ السلام سے نافرمانی سرزد ہو جاتی تو لوگوں کا اس گناہ میں بھی اقتدا کرنا واجب ہو جاتا اور یہ باطل ہے۔

چودھویں دلیل: اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے۔

لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ (بقرہ:۱۲۴)

ترجمہ: "میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔"

اور جو بھی گناہ کا ارتکاب کرے گا وہ اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہوگا۔ اسلئے کہ ارشاد باری ہے فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ج (فاطر: ۳۲)

جب تو یہ مقدمہ پہچان چکا تو اب ہم کہتے ہیں کہ جس عہد کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ یہ ظالموں تک نہیں پہنچے گا یا تو یہ عہد نبوت ہوگا اور یہ بعینہ ہمارا مقصود ہے یا عہد امامت مراد ہوگا اور اس صورت میں تو یہ ہمارے مدعی کیلئے زیادہ واضح دلیل ہوگی۔ اسلئے کہ امامت رُتبہ میں نبوت سے کم ہوا کرتی ہے، جب عہد امامت نافرمان وعاصی کو حاصل نہیں ہے تو کیسے ان کے ساتھ عہد نبوت کر کے ان کو نبوت دی جائے گی۔

پندرھویں دلیل: روایت میں ہے کہ حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ

Marfat.com

حضور ﷺ کے دعوے کے مطابق گواہی دی جبکہ لین دین کے وقت موجود نہ تھے۔ (اس گواہی پر اعتراض کرنے والوں نے اعتراض کیا) تو انہوں نے کہا کہ جب میں عالم بالا کی خبروں کے بارے میں ان کی تصدیق کر رہا ہوں تو کیوں دنیادی معاملے میں ان کی تصدیق نہ کروں؟ جب اسکا تذکرہ دربار رسول اللہ ﷺ میں ہوا تو آپ ﷺ نے اس کی تصدیق فرمائی اور ان (حضرت خزیمہؓ) کو ذوالشہادتین (یعنی ان کی گواہی دو کے برابر ہے) کا لقب عطا فرمایا تو اگر انبیاء علیہم السلام سے گناہ کرنا جائز ہوتا تو خزیمہ رضی اللہ عنہ کی یہ گواہی ناجائز ہوتی۔

امام رازی نے انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے متعلق ان دلائل کے ذکر کرنے کے بعد وہ دلائل ذکر کئے ہیں جن سے فرشتوں کی عصمت ثابت ہوتی ہے۔

پہلی دلیل: اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے فرشتوں کی صفت میں کہ:

يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ (النحل:۵۰)

ترجمہ: ”وہ اپنے بالا دست رب سے ڈرتے ہیں اور انہیں جو حکم دیا جاتا ہے وہ بجالاتے ہیں۔“

یہ آیت شامل ہے سارے مامورات کو کرنے اور منہیات چھوڑنے کو اور عصمت بھی اس کا نام ہے، اسلئے کہ جب کسی کو کام کرنے سے روکا گیا تو ضرور اس کو اس کام کے چھوڑنے کا حکم دیا گیا۔

دوسری دلیل: فرشتوں کی مدح میں فرمایا گیا:

بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۙ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ (الانبیاء/۲۷،۲۶)

ترجمہ: ”بلکہ وہ معزز بندے ہیں بات کرنے میں ان سے پیش قدمی نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم پر کام کرتے ہیں۔“

تیسری دلیل: ارشاد خداوندی ہے:

يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ﴿۲۰﴾ (الانبیاء:۲۰)

ترجمہ: ”رات دن تسبیح کرتے ہیں، سستی نہیں کرتے۔“

Marfat.com

جو مخلوق دن رات تسبیح و تہلیل میں لگی رہے اسے گناہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

چوتھی دلیل: فرشتے اللہ کے رسل ہیں جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے:

جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا۔ (فاطر:۱)

ترجمہ: "فرشتوں کو رسول بنانے والا ہے۔"

اور رُسل معصوم ہوتے ہیں، اور ان کا معصوم ہونا اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (الانعام:۱۲۴)

ترجمہ: "اور اللہ بہتر جانتا ہے کہ اپنے پیغمبری کا کام کس سے لے۔"

ان دلائل و براھین کے بعد یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہی کہ فرشتے اور انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے سے معصوم ہیں، اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو تمام نافرمانیوں سے حفاظت میں رکھتے ہیں۔

ہم نے ان شبہات اور اعتراضات کو ابحاث (بحث کرنا) کا نام دیا ہے اور ان کے جوابات کو وضاحت کا نام دیا، اس لئے کہ اعتراضات اور شبہات کے الفاظ کو ان معصوم ہستیوں کے لئے مناسب نہیں سمجھا۔ اللہ رب العزۃ سے دست بدعا ہوں کہ ہماری اصلاح فرمائے اور ہم سے راضی ہو جائے۔

ابو اللیث غلام محمد میمن
مہتمم مدرسہ مفتاح العلوم حمادیہ
فیض واہ نزد گاڑھی موری
ضلع خیرپور میرس۔ سندھ
محرم ۱۴۳۳ھ

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق ابحاث

کیا حضرت آدم علیہ السلام سے عصیان ہوا تھا؟

ا۔ پہلی بحث: حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ السلام کے متعلق قرآن کریم میں ہے وَعَصٰی اٰدَمُ رَبَّہٗ فَغَوٰی (طٰہٰ:۱۲۱) یعنی آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی پھر بھٹک گیا۔ تو اس سے ثابت ہوا ہے کہ آدم عاصی (نافرمان) اور بھٹکا ہوا ہے یعنی راہِ راست پر نہیں تھا۔ اور یہ بات نبوت کے شایانِ شان نہیں ہے۔ نبی کے عصمت کے خلاف ہے۔

۲۔ بحث: اسی طرح حضرت آدم کے متعلق بتایا گیا۔

وَلَقَدْ عَہِدْنَا اِلٰی اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَہٗ عَزْمًا ط

اور ہم نے تاکید کر دی تھی آدم کو اس سے پہلے پھر بھول گیا اور نہ پائی ہم نے اس میں کچھ ہمت۔

معلوم ہوا کہ آدم علیہ السلام نے غفلت اور بے پرواہی اختیار کی جب بھول گیا اور اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد میں ایسی غفلت اور لاپرواہی کرنا گناہ ہے جو کہ عصمت نبوت کے خلاف ہے۔

۳۔ بحث: درخت سے پھل کھانے کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے انہیں ظالم کہا ہے۔ فَتَکُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (البقرہ:۳۵)

پس تم دونوں ظالم لوگوں میں سے ہو جاؤ گے اور وہ خود بھی اعتراف کرتے ہیں کہ ہم نے اپنے ساتھ ظلم کیا ہے۔

Marfat.com

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (الاعراف:۲۳)

اے ہمارے رب! ہم نے ظلم کیا اپنی جان پر۔

وضاحت۔ بحث اول: وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا۔ جزماً (تنویر المقباس) عَزْمًا۔ ہمت۔ قصد (عمدۃ اللغات) عَصٰى: نافرمانی کی۔ عِصْیَانٌ: گناہ۔ معصیت۔ حکم کی مخالفت

عَصٰى اٰدَمُ۔ ای خالف نہیہ فالعصیان ہوالمخالفۃ خالف بتاویل

(۱) لانہٗ اعتقدان احدًا لایحلف باللہ کاذبا

(۲) اولانہٗ اعتقدان النہی قد نسخ لما حلف لہ ابلیس

(۳) او لانہٗ اعتقد ان النہی عن شجرۃٍ معینۃٍ وان غیرھا من بقیۃ افراد الجنس لیس منہیا عنہ

یعنی آدم علیہ السلام نے حکم کی مخالفت کی پس عصیان حکم کے مخالف کو کہتے لیکن یہ مخالفت تاویل کے ساتھ

توجیہ ۱: کہ آدم علیہ السلام کا خیال تھا کہ کوئی شخص اللہ رب العزت کی جھوٹی قسم نہیں کھائیگا اور شیطان نے آدم و حوا کو یقین دلانے کیلئے جھوٹی قسم کھائی تھی وقاسمھما انی لکما لمن الناصحین۔

توجیہ ۲: کہ آدم علیہ السلام کا خیال تھا کہ جب ابلیس قسم کھاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا نہی والا حکم اب منسوخ ہو چکا ہے۔

توجیہ ۳: آدم علیہ السلام نے خیال کیا کہ اللہ رب العزت کی نہی اس اشارہ کردہ معین درخت سے ہے، نہ کہ جنس درخت سے۔ اور یہ معصیت یعنی مخالفت کبھی وجوبی امر کی مخالفت میں استعمال ہوتا ہے تو کبھی استحبابی امر کی مخالفت میں استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ عرب کہتے ہیں "اشرت علیہ فی امرولدہ بکذا فعصانی" یعنی میں نے فلاں کو اس کے بیٹے کے متعلق رائے دی تو اس نے میری نہیں مانی۔ یا میں نے دوا پینے کو کہا تو اس نے میری نافرمانی کی، یعنی دوا نہیں پی۔ امر وجوب اور استحباب دونوں کیلئے استعمال ہوتا۔ (عصمت انبیاء ص ۴۵)

Marfat.com

حضرت آدم علیہ السلام کی عصمت

اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد اب حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ پر غور کیجئے اور نظر ڈالئے کہ قرآن عزیز میں "سورہ بقرہ" میں جب یہ واقعہ بیان کیا گیا تو صاف طور پر واضح کر دیا گیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی طرف سے نہ گناہ تھا نہ ہی نافرمانی، بلکہ معمولی قسم کی لغزش تھی جسے ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ (سورۃ البقرہ: ۳۶)

پس شیطان نے ان دونوں کو پھسلا دیا۔

اور اس کے بعد سورۃ "اعراف" اور "طٰہٰ" میں دو جگہ اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے "وسوسہ" سے تعبیر کیا۔

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ (الاعراف: ۲۵)

پھر بہکایا انکو شیطان نے۔

اور "طٰہٰ" میں تیسری جگہ اس لغزش اور وسوسہ کا خود ہی سبب بیان کر کے حضرت آدم علیہ السلام کو ہر قسم کے ارادی اور عملی گناہ سے پاک ظاہر کیا اور ان کی عصمت کے مسئلہ کو زیادہ سے زیادہ محکم اور مضبوط بنا دیا۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (سورۃ طٰہٰ آیت ۱۱۵)

اور ہم نے تاکید کر دی تھی آدم کو اس سے پہلے پھر بھول گیا اور نہ پائی ہم نے اس میں کچھ ہمت۔

(یعنی ہم نے اس کو اقرار کو پورا نہ کرنے میں اس کے ارادہ اور قصد کا دخل نہیں پایا۔)

یہ آیات صاف طور پر وضاحت کرتی ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام نے کسی قسم کا کوئی گناہ نہیں کیا جس حد تک معاملہ پیش آیا اس میں بھی ان کے قصد و ارادہ سے خلاف ورزی کا مطلق کوئی دخل نہیں ہے بلکہ وہ ایک وسوسہ تھا جو لغزش کی شکل میں ان سے صادر ہو گیا اور وہ بھی نسیان اور بھول چوک کے ساتھ۔

Marfat.com

ان تمام تصریحات کے بعد اب سورہ طٰہٰ کی مسطورہ ذیل آیت کا مقصد خود بخود صاف ہو جاتا ہے۔

وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى (طٰہٰ: ۱۲۱)

اور آدم نے اپنے پروردگار کا حکم پورا نہ کیا اور وہ بہک گیا۔

ہم نے اس جگہ عصیان اور غوایت کے وہ معنی نہیں لئے جو عام بول چال میں بولتے جاتے ہیں یعنی "گناہ" اور "گمراہی" اور ایسا تاویل بعید یا دور از کار توجیہ کیلئے نہیں کیا گیا بلکہ لغت اور علم معانی کے عام اصول کے زیر نظر ہی کیا گیا ہے اور اسکے لیے لغت عربی کی مشہور کتاب "لسان العرب" اور "اقرب الموارد" وغیرہ میں ہے "المعصية، مصدر وقد تطلق على الزلة مجازاً" (معصیۃ مصدر ہے اور کبھی مجاز کے طور پر لغزش کے معنی میں استعمال ہوتا ہے) اسی طرح "غوی" کے معنی یہاں ضَلَّ یا خَابَ کے ہیں پس اگر یہاں ضَلَّ مراد ہیں تو اس کا اردو ترجمہ "بہک گیا" کیا جائے گا اور خَابَ مراد ہیں تو نقصان میں پڑ گیا۔

بہر حال واقعہ سے متعلق ان تمام آیات کو اور ان آیات کو جو حضرت آدم کی جلالت قدر، صفوت و برگزیدگی اور خلعت خلافت سے سرفرازی کو ظاہر کرتی ہیں، جدا جدا کر کے نہ دیکھا جائے "جیسا کہ معترضین کا عام قاعدہ ہے اور جو اکثر قرآن فہمی میں گمراہی کا سبب بنتا ہے اور سب کو یکجا جمع کر کے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ حضرت آدم کی عصمت کا مسئلہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے اور اس میں قطعی کسی شائبہ، ریب و شک کی گنجائش نہیں ہے۔

اور بالفرض اگر "عصی" اور "غوی" کو عام معنی میں لیا جائے تب بھی وہ اصول پیش نظر رکھنا ضروری ہے جو مسئلہ "عصمت" کی حقیقت کے سلسلہ میں بیان ہوتا ہے کہ جب نصوص قرآن حضرت آدم کی نبوت، صفوت اور خلافت جیسے عظیم الشان مراتب کا اظہار کرتی ہیں تو اس آیت میں ان کی لغزش کو ان سخت الفاظ کے ساتھ اسلئے یاد کیا گیا کہ آدم جیسے مقرب بارگاہ الٰہی کیلئے جس کو خود اللہ تعالیٰ کی براہ راست،

Marfat.com

ہمکلامی کا شرف حاصل ہے، یہ لغزش اور نسیان بھی اس کے مرتبہ سے نازل اور غیر موزوں ہے لہٰذا زیادہ سے زیادہ قابل گرفت ہے اگرچہ ابرار و نیکوکار انسانوں کے حق میں اس قسم کی غلطی ایک معمولی بات ہی کیوں نہ ہو۔ (قصص القرآن)

حضرت شیخ القرآن رحمۃ اللہ علیہ یوں فرماتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے تمام پیغمبر علیہم الصلوٰۃ والسلام ہر قسم کے گناہوں سے پاک ہیں اور معصوم ہوتے ہیں مگر یہاں شبہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ کی نافرمانی کس طرح کی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ معصیت اور لغزش میں فرق ہے معصیت تو یہ ہے کہ نافرمانی کی نیت سے بالارادہ خدا کے حکم کو ٹھکرا دیا جائے یہ چیز عصمت کی منافی ہے اور اس کا صدور انبیاء علیہم السلام سے ناممکن اور محال ہے۔ اور لغزش وہ فعل ہے جو بلا قصد وارادہ مخالفت اللہ کے حکم کے بظاہر خلاف سرزد ہو جائے، ایسی لغزش کا صدور عصمت کے منافی نہیں اور اس کا وقوع انبیاء علیہم السلام سے ممکن ہے۔ وھذا دلیل علی انہٗ یجوز اطلاق اسم الزلۃ علی الانبیاء علیہم السلام کما قال مشائخ بخاری فَاِنَّہٗ اسم الفعل یقع علی خلاف الامر من غیر قصد الی الخلاف کَزَلَّۃِ الماشی فی الطین

(مدارک التنزیل ص ۴۳ ج ۱ المکتبہ علمیہ لاہور)

لیکن انبیاء علیہم السلام کو ان لغزشوں پر قائم نہیں رہنے دیا جاتا بلکہ بذریعہ وحی انہیں اطلاع دے کر انکی تلافی کرا دی جاتی ہے اور اگر ان کا تعلق ان کی اپنی ذات سے ہے تو اس کی تلافی استغفار سے کرا دی جاتی ہے۔ یہاں حضرت آدمؑ سے بھی اسی قسم کی لغزش سرزد ہوئی تھی۔ اس کے صدور میں ان کے قصد اور ارادہ خلاف کو قطعاً کوئی دخل نہیں تھا۔ چنانچہ سورۃ طٰہٰ میں خود اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق فرما دی ہے فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَہٗ عَزْمًا یعنی آدم علیہ السلام اس معاملہ میں بھول گئے تھے عزم و ارادہ سے انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ (جواہر القرآن ص ۱۳۱ ج ۱)

Marfat.com

دوسری بحث: حضرت آدم علیہ السلام کا بھول جانا

وضاحت: رہی بات نسیان کی تو نسیان انسان کی طبعی چیز ہے اسی نسیان کی وجہ سے تو اسکو انسان کہا جاتا ہے۔ عن ابن عباس قال انّما سُمّیَ الاِنْسَانُ لِاَنَّہٗ عُہِدَ اِلَیْہِ فَنَسِیَ (تفسیر ابن کثیر ج۳ ص ۲۲۴)

نسیان نہ عیب ہے نہ گناہ کیونکہ شریعت نے ناسی کو مرفوع القلم قرار دیا ہے اور یہ نسیان آدم علیہ السلام کی غفلت اور لاابالی کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ طبعی اعتبار سے تھا۔

تیسری بحث: حضرت آدم کا اپنے آپ کو ظالم کہنا

وضاحت: یہاں ظلم کبائر کی معنی میں نہیں ہے، بلکہ اپنی لفظی معنی کے اعتبار سے۔ ہے کہ وضع الشئی فی غیر محلہ اور آدم علیہ السلام کا اپنے آپ کو ظالم کہنا اس اصول کے اعتبار سے ہے کہ حسنات الابرار سئیات المقربین۔ نیز یہ ان کی حد تضرع اور انتہائی عاجزی کا اظہار ہے اور یہ چیز شانِ نبوت ہے کہ بندہ اپنے معبود کے سامنے عجز و انکساری کا اظہار کرتے ہوئے اپنی بندگی کا ثبوت دے۔

Marfat.com

ابحاث حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق

بحث اول: نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اپنے بیٹے کے متعلق نجات کا سوال کرنا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ کرنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ نوح علیہ السلام کی یہ خطا تھی۔

بحث ثانی: کہتے ہیں کہ یہ بیٹا نوح علیہ السلام کا صلبی نہیں تھا بلکہ انکی اہلیہ کا زنا سے تھا۔

درج بالا باتوں سے نوح علیہ السلام کی عصمت داغدار ہوتی ہے۔ کہ معاذ اللہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نافر کی جبکہ انہیں ایسے سوالات منع بھی کیا گیا تھا، دوسری بات

۲۔ کہ انکی بیوی زانیہ تھی، یہ بھی در حقیقت شوہر کی شکایت ہے۔

۳۔ جب بیٹا زنا سے تھا تو نوح علیہ السلام کا یہ کہنا کہ "اِنَّ ابۡنِیۡ مِنۡ اَهۡلِیۡ" بیشک میرا بیٹا ہے میرے خاندان سے ہے، یہ جھوٹ ہے اور جھوٹ معصیت ہے۔

بحث ثانی کی وضاحت:

نوح علیہ السلام کے اس بیٹے کا نام تفاسیر میں کنعان ملتا ہے یہ کہنا کہ زنا سے تھا یہ بلکل غلط ہے کیونکہ اللہ رب العزت کا فرمان ہے۔

اَلۡخَبِيۡثٰتُ لِلۡخَبِيۡثِيۡنَ وَالۡخَبِيۡثُوۡنَ لِلۡخَبِيۡثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيۡنَ وَالطَّيِّبُوۡنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوۡنَ مِمَّا يَقُوۡلُوۡنَ ؕ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّرِزۡقٌ كَرِيۡمٌ

(سورۃ نور آیت ۲۶).

Marfat.com

ترجمو: ناپاک عورتیں تو ناپاک مردوں کے لئے ہوتے ہیں اور ناپاک مرد ناپاک عورتوں کے لئے اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لئے ہوتی ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لئے ہوتے ہیں۔

یہ اخبار عام ہے جو ماضی اور مستقبل سب کو شامل ہے تو اس سے ثابت ہوا کہ انبیاء علیہم السلام سراپا پاکیزہ شخصیات ہیں۔

لہٰذا نوح علیہ السلام پاکیزہ ہیں تو ان کی اہلیہ بھی اس عیب سے پاک ہیں۔ وقال ابنُ عَبّاسٍ وَغَیْرُ وَاحِدٍ مِّنَ السّلف۔ مَازَنَتِ امْرَأَۃُ نَبِیٍّ قَطُّ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور بہت سے اسلاف کا کہنا ہے کہ کسی بھی پیغمبر کی بیوی کبھی بدکار نہیں ہوئی۔

باقی یہ کہ یہ صلبی بیٹا تھا یا ربیب تو اس کے متعلق اکثر مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ صلبی بیٹا تھا اور یہی قول قوی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وَنَادٰی نُوْحُ ابْنَہٗ" کہ نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو آواز دی، لیکن بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ بیٹا نوح علیہ السلام کا ربیب، یعنی گود میں پلنے والا سوتیلا بیٹا تھا نوح علیہ السلام کے اور بیٹوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے اس پر بھی ابن کا لفظ اطلاق کیا گیا جیسا کہ ابلیس کا فرشتوں کے ساتھ اختلاط ہوا تو اس پر بھی فرشتہ کا اطلاق ہوا اور اس پر یہ دلیل دیتے ہیں کہ اگر یہ نوح علیہ السلام کا صلبی لڑکا ہوتا تو "من اھلی" کے بجائے "مِنّی" کہتے۔ بہر حال صلبی ہے تو ٹھیک، اگر ربیب یعنی سوتیلا ہے یا متبنیٰ ہے تو بھی نوح علیہ السلام کیلئے عیب نہیں اور ان کی عصمت داغدار نہیں ہو سکتی کیونکہ لے پالک متبنیٰ بنانا عیب نہیں ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ کو متبنیٰ بنایا تھا۔

بحث اول کی وضاحت:

توجیہ ا: یہ بات کہ نوح علیہ السلام کا بیٹے کی نجات کیلئے اللہ رب العزت سے سوال کرنا تو اس سلسلہ میں کچھ محققین کا جیسا کہ امام ماتریدی وغیرہ نے کہا ہے کہ وہ منافق تھا، اور

Marfat.com

حضرت نوح علیہ السلام کو اس کا علم نہ تھا وہ اسے اپنے دین توحید پر سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے کشتی میں سوار ہو جانے کو کہا اِنَّمَا نَادَاهُ لِاَنَّهٗ كَانَ يُنَافِقُهٗ فَظَنَّ اَنَّهٗ مُؤْمِنٌ وَاخْتَارَهٗ كَثِيْرٌ مِّنَ الْمُحَقِّقِيْنَ كَالْمَاتُرِيْدِيْ وَغیرہ۔ (روح المعانی ج ۷ ص ۵۹)

لہٰذا نوح علیہ السلام نے ظاہر کے اعتبار سے اپنے اہل میں سے سمجھا اور اللہ رب العزت کے حضور میں عرض کیا اِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ کہ بیشک تیرا وعدہ حق ہے اگر نوح علیہ السلام اپنے بیٹے کو مومن نہ سمجھتے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک پیغمبر دوسرے کافروں کی ہلاکت کا خواہاں ہو اور اپنے کافر بیٹے کی سلامتی کا متمنی ہوں۔

اِذْ مَحَالٌ اَنْ يَّسْاَلَ هَلَاكَ الْكُفَّارِ ثُمَّ يَسْاَلُ فِيْ اِنْجَاءِ بَعْضِهِمْ وَكَانَ ابْنُهٗ يُسِرُّ الْكُفْرَ وَيُظْهِرُ الْاِيْمَانَ (قرطبی ج ۹ ص ۴۵)

دوسری توجیہ: کہ کنعان کا کفر ظاہر تھا اور نوح علیہ السلام اسکو کافر جانتے تھے جیسا کہ بعض مفسرین کی راء ہے۔

وَقِيْلَ كَانَ يَعْلَمُ اَنَّهٗ كَافِرٌ اِلٰى ذَالِكَ الْوَقْتِ لٰكِنَّهٗ علیسلم ظَنَّ اَنَّهٗ عِنْدَ مُشَاهَدَةِ تِلْكَ الاهوال وَبُلُوْغِ السَّيْلِ الزُّبٰى يَنْزَجِرُ عَمَّا كَانَ عَلَيْهِ (روح المعانی ج ۷ ص ۵۹)

یعنی نوح علیہ السلام کو بیٹے کا کفر تو معلوم تھا لیکن ان کا خیال تھا کہ جب یہ ایسے ہولناکی اور سیلاب دیکھے گا تو متنبہ ہو کر توبہ کریگا اور ایمان لے آیگا اور ادھر اللہ رب العزت کے اس فرمان "اِحْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ" یعنی کشتی میں چڑھائے ہر قسم سے جوڑا دو عدد اور اپنے گھر کے لوگ مگر جن پر پہلے ہو چکا ہے حکم۔ اس سے بیٹے کی صراحت نہ تھی، لہٰذا پدری شفقت کے اعتبار سے آس لگائی کہ شاید متنبہ ہو چکا ہو گا اور اسکی نجات ہو جائے تب اللہ تعالیٰ کی طرف سے وضاحت ہوئی۔ "اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ" کہ یہ آپ کے اس اہل میں سے نہیں ہے بلکہ یہ مشرک ہے اور ابھی تک شرک پر قائم ہے۔

"فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ" کہ جس چیز کا آپ کو علم نہیں ہے تو اس کے

Marfat.com

متعلق آپ سوال نہ کریں اس آیت سے پہلی توجیہ کی توثیق ہوتی کہ کنعان منافق تھا۔ اس کا کفر نوح علیہ السلام کو معلوم نہ تھا، جب حقیقت کھل گئی تو نوح علیہ السلام نے اپنے پیغمبرانہ شان سے محسوس کیا کہ سوال بے محل تھا لہٰذا حسنات الابرار سئیات المقربین کے اعتبار سے شانِ نبوت یہ تھی کہ استغفار اور رحمت کی درخواست کی جائے، لہٰذا یہ گناہ نہیں تھا جو عصمت نبوت کو داغدار بنائے۔

اس کے علاوہ تیسری یہ توجیہ: بھی ہو سکتی ہے کہ نوح علیہ السلام کا یہ اجتہاد تھا کیونکہ اس سوال تک ایسی ممانعت صراحت سے نہیں تھی جب صراحت ہو گئی تو نوح علیہ السلام رک گئے جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ بن ابی بن سلول کے جنازہ میں شرکت فرمائی اور اس کی قبر پر کھڑے ہوئے اور وجہ یہی تھی کہ منع کی کوئی واضح صورت نہیں تھی، لیکن بعد میں جب منع ہوئی فَلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِہٖ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم رک گئے۔

"اِنَّہٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ" میں بعض حضرات نے اِنَّہٗ کا ضمیر نوح علیہ السلام کے اس سوال کی طرف راجع کیا ہے، لیکن اس کی دوسری صورت یہ بھی ہے کہ اس ضمیر کو ابن یعنی کنعان کی طرف راجع کیا جائے اس صورت میں کچھ محذوف ماننا ہو گا اور عبارت یوں ہو گی فَاِنَّہٗ عَمِلَ عَمَلاً غَیْرَ صَالِحٍ یعنی یہ کنعان اس نجات کا اہل نہیں ہے کیونکہ اس نے صالح عمل نہیں کیا۔ (استفادہ: جواہر القرآن، ابن کثیر)

تحقیق آیت ضرب اللہ۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ امْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَیْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَیْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ یُغْنِیَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا وَّ قِیْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِیْنَ۔ (سورہ تحریم آیت ۱۰)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کافروں کیلئے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کے مثال بیان فرماتا ہے وہ دونوں ہمارے نیک بندوں میں سے دو بندوں کے نکاح میں تھیں، سو ان عورتوں نے ان بندوں سے خیانت کی تو وہ دونوں (ان کے شوہر نوح و

Marfat.com

لوط) اللہ کے مقابلے میں ان کے (فائدے میں) ذرا بھی کام نہ آسکے اور ان دونوں (عورتوں) کو حکم ہوا کہ جہنم میں داخل ہونے والوں کے ساتھ تم بھی داخل ہو جاؤ۔

قابل بحث: فَخَانَتَاهُمَا۔ بعض لوگوں نے خیانت سے مراد بدکاری لی۔ہے جو سراسر غلط اور عصمت انبیاء علیہم السلام کے منافی ہے، ہم پچھلے صفحات میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کر چکے ہیں کہ کسی نبی کی بیوی بدکار نہیں ہو سکتی۔

فَاِنَّ نِسَآءَ الْاَنْبِيَاءِ مَعْصُوْمَاتٌ عَنِ الْوُقُوْعِ فِى الْفَاحِشَةِ لِحُرْمَةِ الْاَنْبِيَاءِ

(ابن کثیر سورۃ تحریم)

یقیناً تمام انبیاء علیہم السلام کی عورتیں انبیاء علیہم السلام کی عزت و حرمت کی وجہ سے بے حیائی وبدکاری سے معصوم ہیں۔

قال ما زنتا اما خیانۃ امرأۃ نوح فکانت تخبر انہ مجنون، واما خیانۃ امرأۃ لوط فکانت تدل قومھا علی اضیافہ وقال العوفی عن ابن عباس قال کانت خیانتھما انھما کانتا علی غیر دینھما فکانت امرأۃ نوح تطلع علی سر نوح فاذا آمن مع نوح احدٌ اخبرت الجبابرۃ من قوم نوح بہ واما امرأۃ لوط فکانت اذا اضاف لوط احداً اخبرت بہ اھل المدینۃ ممن یعمل السوٓء وقال الضحاک عن ابن عباس ما بغت امرأۃ نبی قط انما کانت خیانتھما فی الدین۔ (ابن کثیر سورۃ تحریم ج ۴ ص ۵۰۴)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا کہنا ہے کہ یہ دونوں زانیہ نہیں تھیں، نوح علیہ السلام کی بیوی کی خیانت یہ تھی کہ وہ ان کو مجنوں، پاگل بتلاتی تھی اور لوط علیہ السلام کی بیوی اپنی قوم کو ان کے مہمانوں کے متعلق اطلاع دیتی تھی حضرت عوفی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ فرمایا ان دونوں کی خیانت یہ تھی کہ یہ دونوں ان دونوں پیغمبروں کے دین پر نہ تھیں، نیز نوح علیہ السلام کی بیوی ان کا راز فاش کرتی تھی کہ جب بھی کوئی آدمی نوح علیہ السلام پر ایمان لے آتا تھا تو یہ قوم کے سرکش لوگوں کو اطلاع دیتی تھی (تاکہ وہ اس مومن کے ساتھ سختی کریں اور اس کو مرتد کر دیں) اور

Marfat.com

حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی ان کے مہمانوں کے متعلق شہر کے لوگوں کو اطلاع دیتی تھی (تاکہ وہ اپنی بے حیائی کی وجہ سے حضرت لوط کو پریشان کریں) حضرت ضحاک نے بھی حضرت ابن عباس سے ایسی روایت نقل کی ہے کہ کسی بھی نبی کی بیوی نے کبھی بھی بدکاری نہیں کی، ان دونوں کی خیانت دین کے بابت تھی۔

فخانتھما: فی الدین اذ کفرتا وکانت امرأۃ نوح واسمھا واھلۃ تقول لقومہ انہ مجنون وامرأۃ لوط واسمھا واعلۃ تدل علی اضیافہ اذا نزلوا بہ (جلالین سورۃ تحریم)

ان دونوں کی خیانت یہ تھی کہ ان دونوں نے کفر کیا اور نوح علیہ السلام کی بیوی جس کا نام واھلہ تھا یہ اپنی قوم کو کہتی تھی کہ نوح پاگل ہے اور لوط علیہ السلام کی بیوی جس کا نام واعلہ تھا یہ لوط علیہ السلام کے مہمانوں کا لوگوں کو اطلاع دیتی تھی۔ ان تمام حوالہ جات سے واضح ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بیویاں کبھی بھی بدکار اور فاحشہ نہیں تھیں، البتہ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان پیغمبروں کی شریعت میں مومن و کافر کی عقد نکاح جائز تھی۔

مطلب: اس آیت میں بتلانا مقصود ہے کہ نجات کیلئے ایمان شرط ہے اگر ایمان نہیں تو کوئی بھی رشتہ اور قرابت کام نہیں آئیگی، گرچہ وہ رشتہ بیوی اور بیٹے جیسا قریبی کیوں نہ ہو۔ خلاصہ یہ ہوا کہ یہ دونوں عورتیں ایمانیات میں اپنے شوہروں کی اطاعت نہیں کرتی تھیں، اس لئے برباد ہو گئیں۔ (استفادہ: ابن کثیر، جلالین وغیرھما)

Marfat.com

ابحاث حضرت لوط علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق

بحث اول: حضرت لوط علیہ السلام نے قوم کے فساق کو اپنی لڑکیوں کی پیشکش کیسے کی؟

حضرت لوط علیہ السلام کے ہاں جب فرشتے حسین و جمیل لڑکوں کی صورت میں آکر مہمان بنے تو قوم کے اوباش آدمی غلط نیت سے دوڑتے آئے، تو حضرت لوط علیہ السلام نے ان سے کہا:

قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِیْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ ﴿۷۱﴾ (الحجر: ۷۱)

یعنی یہ میری لڑکیاں حاضر ہیں اگر تم چاہت رکھتے ہو۔ اس میں شبہ ہوتا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام قوم کے سامنے اپنی لڑکیوں کو بدکاری کیلئے کیسے پیش کرتے ہیں؟

بحث ثانی: کہ جب قوم نے یہ بات بھی نہ مانی اور لڑکوں کے متعلق اصرار کیا تو حضرت لوط علیہ السلام نے کہا:

قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِیْدٍ ﴿۸۰﴾ (ھود: ۸۰)

کاش مجھ کو تمہارے مقابلے کی طاقت ہوتی یا پناہ ملتی کسی زبردست قوت کے ساتھ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے حضرت لوط علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی قدرت پر بھروسہ نہیں رکھتے تھے، جو کسی "رکن شدید" یعنی کسی مضبوط قلعہ اور قوت کی پناہ کے طالب بن بیٹھے!!

Marfat.com

وضاحت بحث اول:

قَالَ یٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِیْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِیْ ضَیْفِیْ ؕ اَلَیْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ (سورۃ ھود آیت ۷۸)

ترجمہ: اور (حضرت لوط علیہ السلام نے) کہا ای قوم یہ میری بیٹیاں (موجود ہیں) تمہاری لئے پاکیزہ ہیں (ان سے نکاح کرلو) سو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور مجھ کو میرے مہمانوں میں رسوانہ کرو کیا تم میں کوئی بھی بھلا آدمی نہیں؟

(ترجمہ تفسیر حقانی)

"اِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِیْنَ" سے قوم کا بضد ہونا معلوم ہوتا ہے "هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ" یہ لوط علیہ السلام کی ان کو نصیحت ہے کہ لڑکوں کے بجائے جائز طریقے سے عورتوں سے ملنا باعث طہارت ہے، معاذاللہ بدکاری کیلئے پیش کرنا ہرگز مقصود نہ تھا باقی یہ دیکھا جائے کہ "بناتی" سے مراد کیا ہے، کیا لوط علیہ السلام کے نسبی وصلبی بیٹیاں مراد ہیں۔

توجیہ ا: تو اس کے متعلق بعض علماء کا خیال ہے کہ لوط علیہ السلام کا مطلب یہ تھا کہ یہ جو سب میری روحانی بیٹیاں تمہاری رفیق حیات ہیں ان سے ملنا تمہارے لیے باعث طہارت ہے تم ان کو چھوڑ کر کیسے خبیث کام پر اصرار کرتے ہو ایسانہ کرو۔ لوط علیہ السلام کا ان کی بیویوں کو "بناتی" اپنی بیٹیاں کہنا، یہ ازروئے شفقت ہے جیسے گاؤں کا بڑا کنبہ قبیلہ کا امتیاز کئے بغیر سب کو بیٹا، بیٹی کہتا ہے۔

اور یہ بات بھی ہے کہ ہر پیغمبر اپنی امت کا روحانی باپ ہوتا ہے، چاہے قوم اطاعت کر کے امت اجابت بنے چاہے کفر پر ڈٹ کر امت دعوت بنے، ہر صورت میں امت بحیثیت اولاد کے ہوتی ہے۔

عَنِ السُّدِیِّ اَنَّ الْمُرَادَ بِبَنَاتِهٖ علیہ السلام اُمَّتُهٗ ـــ لِاَنَّ كُلَّ نَبِیٍّ اَبٌ لِاُمَّتِهٖ

(روح المعانی ج ۷ ص ۱۰۶)

حضرت سدیؒ فرماتے ہیں کہ "بنات" سے مراد حضرت لوط علیہ السلام کی امت کی عورتیں ہیں۔۔۔ کیونکہ نبی اپنی امت کے لئے باپ کا درجہ رکھتا ہے۔

Marfat.com

وَقَالَتْ فِرْقَةٌ مِنْهُمْ مجاهد وجُبَيْرٌ اَشَارَ بِقَوْلِهٖ "بَنَاتِیْ" اِلَى النِّسَاءِ جُمْلَةً اِذْ نَبِیُّ الْقَوْمِ اَبٌ لَّهُمْ (قرطبی ج۹ ص۷۶)

ایک جماعت کا کہنا ہے اور مجاہد اور جبیر کا بھی یہی کہنا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کے "بناتی" کہنے سے ان کا اشارہ قوم کی تمام عورتوں کی طرف تھا کیونکہ قوم کا نبی ان کے لئے باپ کی حیثیت رکھتا ہے۔

توجیہ ۲: بعض علماء کا کہنا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کی صلبی بیٹیاں مراد ہیں۔ بات یہ تھی جب ان لوگوں کو ان مہمانوں کا پتہ چلا تو اس قوم کے دو سردار خواہشمند ہو کر آئے اور باقی قوم ان کی حمایت میں آکر کھڑی ہوئی تو حضرت لوط علیہ السلام نے ان دونوں سرداروں کو خوب سمجھایا کہ اس خبیث و شنیع مطالبہ سے باز آجاؤ، میں اس کیلئے تیار ہوں کہ اپنی دونوں لڑکیوں کا نکاح تم سے کر دوں مگر انہوں نے انکار کیا اور کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ ہم عورتوں سے رغبت نہیں رکھتے۔

تو نکاح میں لڑکیوں کا دینا، کوئی قابل قباحت امر نہیں یہی هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ کا مقصد ہے۔ باقی اگر کسی کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو کہ کافروں سے مسلمان لڑکیوں کا نکاح کیسے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کی شریعت میں ایسی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ دیکھو خود حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کافرہ تھی جو اسی عذاب میں تباہ ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شریعت میں مسلم و کافر کی عقد نکاح درست تھی۔ نیز ہماری شریعت میں بھی یہ حرمت بعد میں ہوئی، جبھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی حضرت زینب کا نکاح ابوالعاص سے کیا تھا جو بعد میں مسلمان ہوا۔

دوسری بحث۔ لوط علیہ السلام کا رکن شدید کی طلب کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟

وضاحت، دوسری بحث: "رکن شدید" کی طلب کرنا اس سے کسی قلعہ یا کوئی غیر اللہ کی طاقت مراد نہ لی جائے کیونکہ اس کی وضاحت صحیح بخاری کی روایت سے بخوبی ملتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

Marfat.com

یَغْفِرُ اللّٰہُ لِلُوطٍ اِنْ کَانَ لَیَاوِیْ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ وَھُوَ رَبُّہٗ وَخَالِقُہٗ۔

اللہ تعالیٰ . . . کی بخشش کرے (کہ وہ اس درجہ پریشان کئے گئے) کہ رکن شدید کی پناہ کے طالب ہوئے اور ان کیلئے رکن شدید ان کا پروردگار اور ان کا خالق ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام اللہ تعالیٰ کو بھول کر کسی اور قوت کی پناہ کے طالب نہ ہوئے تھے بلکہ وہ اس درجہ قابل رحم حالت میں تھے کہ اس وقت ان کی یہ تمنا ہوئی کاش اللہ تعالیٰ مجھے ایسی قوت عطا کرتا کہ میں اسی وقت ان سب بدبختوں کو ان کی خباثت کا مزہ چکھا سکتا، پھر "رکن شدید" یعنی ان کے پروردگار اللہ تعالیٰ نے آخر ان کی مدد کی، کہ ان پر فرشتوں نے اپنا راز ظاہر کردیا اور ان کو تسلی اور اطمینان بخشا کہ آپ پریشان نہ ہوں تھوڑا ہی وقت باقی ہے کہ یہ اپنی بدکرداری کے عبرتناک انجام کو پہنچ جائیں گے۔

بعض مفسرین نے "بکم قوۃ" میں "کم" کا مخاطب فرشتوں کو سمجھا ہے اور مراد یہ لیتے ہیں کہ حضرت لوط علیہ السلام نے فرمایا کاش تم اس کثرت سے ہوتے کہ ان کے مقابلہ میں مجھ کو تم سے قوت پہنچتی یا اللہ تعالیٰ کوئی ایسی صورت پیدا کرتا کہ میں ان کو سزا دے سکتا۔ (قصص القرآن، جواہر القرآن)

Marfat.com

ابحاث حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق

بحث ۱: حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کہنا کہ:

"وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِىْ كَيْفَ تُحْىِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰـكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِىْ ؕ "(البقرۃ:۲۶۰) اے میرے پروردگار مجھ کو دکھا کہ تو مردے کو کس طرح زندہ کرے گا؟ (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا کیا تو نے یقین نہیں کیا؟ (ابراہیم نے) کہا کیوں نہیں، لیکن اس واسطے کہ اطمینان ہو جائے میرے دل کو، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے احیاء الاموات پر بغیر دیکھے یقین نہیں تھا اور یہ چیز عقائد کے باب میں جرم ہے اور نبوت کے شایانِ شان نہیں اگر مان لیا جائے کہ ایمان تھا تو کم از کم اتنا تو معلوم ہوا کہ ان کو اطمینان نہیں تھا حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے کہ اگر عالم غیب سے پردہ اٹھا دیا جائے تو میرے یقین و اطمینان میں کوئی زیادتی نہیں آئیگی کیونکہ مجھے ایمان بالغیب سے ہی کامل اطمینان حاصل ہے تو جب بعض امتیوں کو یہ درجہ اطمینان حاصل ہے تو یہ کیسے ہوا کہ خلیل اللہ کو اطمینان کا درجہ حاصل نہ ہوا۔

بحث ۲: کہ ستاروں اور چاند اور سورج کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ھٰذا ربی یہ میرا رب ہے کہنا یا تو جھوٹ ہے یا کفر۔

بحث ۳: کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے کافر باپ کیلئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی طلب کی تھی، جبکہ "مَا كَانَ لِلنَّبِىِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ" (التوبۃ:۱۱۳) "لائق نہیں نبی کو اور مسلمانوں کو کہ بخشش چاہیں مشرکوں کی" لہٰذا کافر

Marfat.com

کیلئے دعا مانگنا جائز نہیں تو ابراہیم علیہ السلام ناجائز امور کا کیوں مرتکب بنے؟ اسی طرح سورۃ ممتحنہ میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی تعریف تو کی گئی ہے لیکن ابراہیم علیہ السلام کی طلب مغفرت والے عمل کی استثناء کی گئی ہے تو معلوم ہوا کہ یہ عمل معصیت ہوگا۔

بحث ۴: وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ۔ (سورۃ ھود، آیت ۶۹)

"اور ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر آئے انہوں نے کہا سلام، اس نے کہا سلام، پس دیر نہ کی کی بُھنا ہوا بچھڑا لے آیا۔"

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے فرشتوں کے سامنے کھانا لا کر رکھ دیا، حالانکہ وہ جانتے تھے کہ فرشتے کھانا نہیں کھاتے تو ان کے سامنے کھانا رکھنا یہ عبث عمل تھا۔

دوسری بات جب انہیں معلوم تھا کہ فرشتے معصوم ہیں تو پھر ان سے کیوں ڈرے، اگر آپ کہہ دیں کہ ابراہیم علیہ السلام کو ملائکہ ہونے کا علم نہ تھا، کیونکہ وہ انسانی شکل میں آئے تھے تو پھر اعتراض ہوگا کہ پھر انہوں نے ان بھیجے ہوئے لوگوں کے دعویٰ کی تصدیق بلا دلیل کیوں کی۔

تیسری بات "یجادلنا فی قوم لوط" کہ ابراہیم علیہ السلام لوط علیہ السلام کی قوم کے متعلق مجادلہ کرنے لگے یہ بات ناجائز معلوم ہوتی ہے کیونکہ اللہ رب العزت نے بھی ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا "یا ابراھیم اعرض عن ھٰذا"

بحث ۵: کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام نے تین جھوٹ بولے ہیں، ایک یہ کہ جب انہوں نے ... کو توڑا اور بولا کہ "بل فعله كبيرهم ھٰذا" ان کے بڑے بت نے یہ کام کیا ہے دوسرا ستاروں کو دیکھ کر لوگوں سے کہا کہ میں بیمار ہوں۔
تیسرا یہ کہ اپنی بیوی کو بادشاہ کے سامنے بہن بتلایا، ایسے جھوٹ ایک پیغمبر کی عصمت کے خلاف ہیں۔

Marfat.com

بحث اول: کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام احیاء الاموات پر ایمان نہیں رکھتے تھے؟

وضاحت: حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی قدرت پر کامل یقین تھا نیز احیاء الاموات پر بھی پورا پورا یقین تھا۔ لیکن وہ اس کی کیفیت کا مشاہدہ کر کے مزید اطمینان قلب حاصل کرنا چاہتے تھے، اسلئے اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کیا کیونکہ جو علم مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے وہ بدیہی اور ضروری ہوتا ہے اور علم استدلالی سے زیادہ محکم اور پائدار ہوتا ہے۔ معناہ بلیٰ اٰمنت ولکن لازید سکونا وطمانیۃ بمضامۃ علم الضرورۃ علم الاستدلال وتظاھر الادلۃ اسکن للقلوب وازید للبصیرۃ

(مدارک التنزیل ج ۱ ص ۱۷۵، مطبع المکتبۃ العلمیۃ لاہور)

لم یکن ابراھیم علیہ السلام شاکا فی احیاء اللہ الموتیٰ قط وانما طلب المعاینۃ

(قرطبی ص ۲۹۷ ج ۳)

اور اللہ تعالیٰ کا یہ سوال کہ کیا تمہیں میری قدرت علی الاحیاء پر ایمان نہیں ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ جواب کہ ایمان تو ہے لیکن آنکھوں سے مشاہدہ کر کے مزید اطمینان چاہتا ہوں اس سوال و جواب سے اسی حقیقت کو واضح کرنا مقصود ہے تاکہ سامعین میں سے کسی کو حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے ایمان کے بارے میں کسی قسم کی غلط فہمی نہ پیدا ہو۔

باقی یہ بات کہ حضرت علی کرم اللہ وجہ کو اطمینان حاصل ہے لیکن ابراہیم علیہ السلام کو حاصل نہیں؟ تو اس کے متعلق اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ اطمینان کے بھی بہت سے درجات ہیں ایک وہ اطمینان ہے جو اولیاء اللہ اور صدیقین کو حاصل ہوتا ہے اور ایک اس سے اعلیٰ مقام اطمینان ہے جو عام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو حاصل ہوتا ہے اور ایک اس سے بھی مافوق ہے جو خاص خاص کو بصورت مشاہدہ عطا فرمایا جاتا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ کو جو درجہ اطمینان کا حاصل تھا وہ بلاشبہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کو حاصل تھا۔ بلکہ اس سے اعلیٰ درجہ اطمینان جو مقام نبوت کے ساتھ خاص ہے اس اطمینان میں حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور سب امتیوں سے فائق تھے، پھر

Marfat.com

جن کو وہ طلب فرما رہے ہیں وہ سب سے اعلیٰ مقام اطمینان ہے جو خاص خاص انبیاء کو عطا فرمایا جاتا ہے جیسے سید الانبیاء حضور اقدس ﷺ کو جنت اور دوزخ کا مشاہدہ کرا کر اطمینان خاص بخشا گیا۔ (استفادہ: مدارک، جواہر القرآن، معارف القرآن)

بحث ثانی: کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام چاند ستاروں کو رب مانتے تھے؟

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ (۷۶) فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ (۷۷) فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (۷۸) (سورۃ انعام)

ترجمہ: پھر جب اندھیرا کر لیا اس پر رات نے، دیکھا اس نے ایک ستارا، بولا یہ ہے میرا رب، پھر جب وہ غائب ہو گیا تو بولا میں پسند نہیں کرتا غائب ہو جانے والوں کو، پھر جب دیکھا چاند چمکتا ہوا بولا یہ ہے رب میرا، پھر جب وہ غائب ہو گیا تو بولا اگر نہ ہدایت کرے گا مجھ کو رب میرا تو بیشک میں رہوں گا گمراہ لوگوں میں۔ پھر جب دیکھا سورج جھلکتا ہوا تو بولا یہ ہے رب میرا یہ سب سے بڑا ہے۔ پھر جب غائب ہو گیا تو بولا اے ی قوم میں بیزار ہوں ان سے جن کو تم شریک کرتے ہو۔ (جواہر القرآن)

وضاحت ۱: حضرت ابراہیم علیہ السلام کا "هٰذَا رَبِّيْ" کہنا نہ جھوٹ ہے نہ کفر ہے حقیقت یہ تھی کہ ان کی قوم بت پرستی کے ساتھ ستارہ پرست بھی تھی وہ لوگ ستاروں اور چاند و سورج کی تعظیم کیا کرتے تھے۔ انہیں رب مانتے تھے۔ لہٰذا حضرت ابرہیم علیہ السلام کا یوں کہنا بطور تعریض و تذلیل ہے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کو بطور طنز کہا تھا "فانظر الی الٰھك الذی ظلت علیه عاکفا" یعنی تیرے خیال کے مطابق یہ تیرا الٰہ (معبود) ہے تو اب دیکھ لے تو اس کا حشر کہ ہم اس کو جلا کر سمندر میں ڈال دیتے ہیں۔۔۔

Marfat.com

توجیہ ۲: اس کی یہ ہے کہ یہ استفہام انکاری ہے، یعنی ابراہیم علیہ السلام کا مطلب یہ تھا۔ کیا یہ ہو سکتا میرا رب؟ پھر عبارت اس طرح ہو گی اَھٰذا ربی یا عبارت یہ ہے "یقولون ھٰذا ربی" یعنی یہ مشرکین مجھے کہتے ہیں کہ یہ تیرا رب ہے۔ حالانکہ اس ستارہ یا چاند یا سورج کو بقا بھی نہیں ہے۔ ان کو پائداری بھی نہیں ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خود کسی کی مخلوق ہے اور میں ایسی ناپائدار چیز کو پسند نہیں کرتا، لہٰذا تم لوگ جو ان کی پرستش کرتے ہو تو میں اس سے بیزار ہوں۔

اس کے متعلق حضرت مولانا سیوہاروی یوں رقمطراز ہیں۔

اس بارہ میں کلی اتفاق کے باوجود کہ ابراہیم (علیہ السلام) نے کبھی کواکب پرستی نہیں کی اور ان کی تمام زندگی شرک کی تلویثات سے پاک ہے۔ سورہ انعام کی مسطورہ بالا آیات کی تفسیر میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، ان آیات کی تمہید میں جو کچھ لکھا گیا وہ ان اقوال میں سے ایک قول کے مطابق ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی یہ گفتگو قوم کی کواکب پرستی کے رد میں اس کو لاجواب کرنے کیلئے تھی، اس لیے کہ جب دو فریق کسی مسئلہ میں اختلاف کر بیٹھتے ہیں تو احقاق حق کیلئے مناظرانہ دلائل میں سے دلیل کا ایک یہ بھی طریقہ ہے کہ اپنے دعوے کے ثبوت میں صرف نظریوں، تھیوریوں (Thorees) سے کام نہ لیا جائے بلکہ مشاہدہ اور معائنہ کی ایسی راہ اختیار کی جائے کہ مخالف اس کے دعوے کے مقابلہ میں لاجواب ہو جائے اور اس کے دلیل کے رد کرنے کی تمام راہیں اس کے سامنے بند ہو جائیں، اب اگر اس مین سلامت روی باقی ہے اور اس کے قلب میں قبول حق کی گنجائش ہے تو اس کو قبول کر لیتا ہے ورنہ بے دلیل لڑنے اور جھگڑنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، تب اس طرح حق و باطل میں امتیاز ہو جاتا ہے اور اصلی اور حقیقی بات نکھر کر صاف ہو جاتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جلیل القدر پیغمبر ہیں، اسلئے ان کی تبلیغ کا مشن منطقی صغریٰ کبریٰ پر قائم نہ تھا۔ بلکہ حقیقت کو فطری دلائل کی سادگی کے ساتھ واضح کرنا ہی ان کا طغرائے امتیاز تھا، اسلئے انہوں نے یہی راستہ اختیار کیا اور قوم پر واضح کر دیا کہ ستارے

Marfat.com

خواہ شمس و قمر ہی کیوں نہ ہوں رب کہلانے کے قابل نہیں ہیں بلکہ ربوبیت صرف اسی کو زیبا ہے جو رب العالمین ہے اور ارضی و سماوی، سفلی و علوی کل کائنات کا خالق و مالک ہے اور چونکہ قوم کے پاس اس بہترین دلیل کا کوئی جواب نہ تھا اسلئے وہ زچ ہوئی اور امر حق کو قبول کرنے کے بجائے لڑنے جھگڑنے پر آمادہ ہوگئی، مگر اس کے ضمیر کو ماننا پڑا کہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے صحیح ہے اور ہمارے پاس اس کا کوئی صحیح جواب نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقصد اور ان کے ادائے فرض کی حد یہیں تک تھی، کیونکہ دل چیر کر حق کو اس میں اتار دینا ان کی طاقت سے باہر تھا۔ (استفادہ، جواہر القرآن، عصمت الانبیاء، قصص القرآن)

بحث ثالث: حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے کافر باپ کیلئے مغفرت کی طلب کرنا:

وضاحت: اس کے متعلق قرآن کریم کی متعدد آیات میں ذکر ملتا ہے۔

(۱) وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ (سورۃ توبہ آیت ۱۱۴)

اور ابراہیم (علیہ السلام) کا اپنے باپ کیلئے دعائے مغفرت مانگنا وہ صرف وعدہ کے سبب سے تھا جو انہوں نے اس سے وعدہ کیا تھا، پھر جب ان پر یہ بات ظاہر ہوگئی کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس سے بیزار ہوگئے بیشک ابراہیم (علیہ السلام) بڑا نرم دل اور بردبار ہے۔

(۲) قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا (سورۃ مریم آیت ۴۷)

(ابراہیم علیہ السلام نے باپ سے) کہا اچھا تم پر سلام ہو، میں اپنے پروردگار سے تمہاری بخشش کی دعا کرونگا، بیشک وہ (میرا پروردگار) مجھ پر مہربان ہے۔

(۳) وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّاۗلِّيْنَ (سورۃ الشعراء آیت ۸۶)

اور میرے باپ کو بخش دے یقیناً وہ گمراہوں میں سے ہے۔

سب سے پہلی بات کہ (آیت سورۃ توبہ)

Marfat.com

"لائق نہیں نبی کو اور ایمان والوں کو کہ بخشش چاہیں مشرکوں کی اگرچہ وہ ہوں قرابت والے جب کہ کھل چکا ان پر کہ وہ ہیں دوزخ والے" (جواہر القرآن)

آیت سے ابراہیم علیہ السلام کا مشرکین کیلئے مغفرت کی طلب کا عدم جواز ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ للنبی میں لام عموم کا تقاضا نہیں کرتا اس اعتبار سے نبی کا اطلاق فقط محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوگا۔

باقی یہ بات کہ حضرت ابراہیم نے اپنے کافر باپ کیلئے مغفرت کی طلب کی؟ تو اسکے متعلق کچھ توجیہات اس طرح ہیں۔

توجیہ ۱: ہوسکتا ہے کہ انکی شریعت میں کافر کیلئے طلب مغفرت کی ممانعت واضح نہ ہو، پدری محبت میں مغفرت کی طلب کی، لیکن بعد میں وضاحت ہوئی ہو، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول کے جنازہ میں اس اعتبار سے شریک ہوئے تھے کہ ممانعت کی صراحت نہیں تھی، لہٰذا امت پر شفقت کرتے ہوئے شرکت کی۔ بعد میں صریح ممانعت ہوئی۔

توجیہ ۲: سورۃ مریم والی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جرئت سے اپنی قوم اور اپنے والد کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا اور توحید کی دعوت دی۔ لیکن باپ نے جب دور ہوجانے کی ڈانٹ دی تو ابراہیم علیہ السلام نے انبیانہ صفت، عدم شدت، ترحم و ترفق کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ میں تیرے لیے اپنے رب سے مغفرت یعنی ہدایت کی درخواست کرونگا تو یہاں مغفرت سے مراد ہدایت ہے جو مغفرت کا دنیوی ثمرہ ہے آگے فرمایا کیونکہ وہ مجھ پر مہربان ہے۔ ٭

ابراہیم علیہ السلام کا "واغفر لابی انہ کان من الضالین" کہنا اسی انجام کے اعتبار سے ہے جو اوپر سورۃ مریم والے مکالمہ میں ہوا تھا۔ "انہ کان من الضالین" دلالت کرتا

٭ ابراہیم علیہ السلام کی اس بات کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ماننا یا نہ ماننا اللہ تعالیٰ کے مہربان ہونے سے منافی نہیں ہے کیونکہ اسمیں حکمت خداوندی ہے اللہ تعالیٰ کی رحمت و مہربانی ہر صورت میں انبیاء علیہم السلام سے شامل حال ہے۔ (ابو اللیث)

Marfat.com

ہے کہ واغفر سے مراد طلب ہدات ہے۔

واغفرلابی بالھدایۃ والتوفیق للایمان۔ (ابو السعود ج۶ ص۵۳۹)

اے میرے پروردگار! میرے باپ کو ایمان کیلئے ہدایت و توفیق دیکر اس کی مغفرت فرمادیجئے۔

توجیہ ۳: وما کان استغفار ابراھیم۔ الآیۃ سے تو ابراہیم علیہ السلام کی صفائی ثابت ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنے باپ میں ایمان کی توقع رکھتے ہوئے یا اللہ رب العزت سے اسکی ہدایت کی طلب کرتے ہوئے اسکی مغفرت مانگنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب محسوس کیا کہ میرا باپ ضدی اور عنید ہے اور توحید ربانی کا دشمن ہے تو انہوں نے اس سے بیزاری اختیار کرلی۔

فلما تَبَیَّنَ لَہٗ کا علماء کرام دوسرا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ جب تک وہ زندہ تھا تو ابراہیم علیہ السلام اس کے لئے ہدایت کی دعا کرتے تھے۔ لیکن جب وہ شرک پر مر گیا تو اس پر واضح ہوگیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے اب اس کیلئے دعا کرنا درست نہیں۔

الاعن موعدۃ وعدھا۔ الآیۃ کا تفسیر علماء کرام سے دو طرح سے منقول ہے ایک کہ اس سے مراد ہے بیٹا یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ سے وعدہ کہ میں تیرے لئے اپنے پروردگار سے مغفرت کی طلب کرونگا۔

دوسرا کہ باپ کا وعدہ تھا بیٹے سے ایمان لانے کا کہ میں ایمان کو قبول کرونگا، اسی اعتبار سے ابراہیم علیہ السلام اسکے لئے مغفرت کی طلب کرنے لگے۔

سورۃ ممتحنہ والی آیت میں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور انکے متبعین کی مدح کی گئی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انکا یہ عمل تو قابل تقلید ہے البتہ ابراہیم علیہ السلام کی طلب مغفرت والے عمل میں تقلید نہ کی جائے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ عمل ہی ناجائز تھا، تاہم اس آیت میں بھی استغفار کو اوپر والی توجیہات تاخیر عذاب یا تخفیف عذاب وغیرہ پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ (استفادہ جواہر القرآن، عصمت الانبیاء)

Marfat.com

بحث رابع: حضرت ابراہیم علیہ السلام کا فرشتوں کے سامنے کھانا رکھنا:

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِیْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِیْذٍ (۶۹) فَلَمَّا رَاٰۤ اَیْدِیَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَیْهِ نَكِرَهُمْ وَ اَوْجَسَ مِنْهُمْ خِیْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ (سورۃ ھود آیت ۶۹، ۷۰)

ترجمہ: اور البتہ آچکے ہیں ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس خوشخبری لیکر بولے سلام وہ بولا سلام ہے پھر دیر نہ کی کہ لے آیا ایک بچھڑا تلا ہوا۔ پھر جب دیکھا ان کے ہاتھ نہیں آتے کھانے پر تو کھٹکا اور دل میں ان سے ڈرا وہ بولے مت ڈر ہم بھیجے ہوئے آئے ہیں لوط کی قوم کے طرف۔ (جواہر القرآن)

وضاحت: پہلی اور دوسری بات کے متعلق یہ جواب ہے کہ ملائکہ انسانی شکلوں میں آئے تھے اور ابراہیم علیہ السلام نے انہیں نہیں پہچانا بلکہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے اپنی مہماندارانہ صفت کے غلبہ سے بغیر تعارف کیئے، بچھڑا بھون کر لایا، جب انہوں نے کھانے کیلئے دستر خوان کی طرف اپنے ہاتھ نہ بڑھائے تب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں خوف سا پیدا ہوا کہ کہیں یہ لوگ برے ارادے سے نہ آئے ہوں، کیونکہ اس وقت کا دستور تھا کہ جس شخص سے کسی برائی کا ارادہ ہوتا تو اس کے گھر کا نمک (کھانا) نہیں کھاتے تھے۔

وکانوا اذا راوا الضیف لا یاکل ظنوا به شراً (قرطبی ج۹ ص ۶۵) حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آثار خوف دیکھ کر فرشتے بول اٹھے کہ آپ ڈریں نہیں ہم تو فرشتے ہیں۔ اس وضاحت سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حقیقت حال کا علم ہوا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے ہونے کی بشارت دی نیز لوط علیہ السلام کی قوم کو تباہ کرنے کی اطلاع دی۔

باقی یہ بات کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بلا دلیل تصدیق کی یہ درست نہیں ہے بلکہ دلیل یہ تھی کہ فرشتوں نے اس بھنے ہوئے بچھڑے کو اللہ تعالیٰ سے دوبارہ زندہ کروایا تھا۔

Marfat.com

"انهم دخلوا علی ابراهیم فقرب الیهم العجل مسحه جبریل بجناحه فقام یدرج حتی لحق بامه وام العجل فی الدار" (ابن کثیر، سورۃ ھود)

یعنی جب یہ فرشتے ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے تو انہوں نے ان کے سامنے (بھنا ہوا) بچھڑا لایا تو جبریل علیہ السلام نے اس بچھڑے کو اپنا پر لگایا تو بچھڑا اچل کر اپنی ماں سے جا ملا اور اس کی ماں اس وقت گھر میں تھی۔

تیسری بات کہ ابراہیم علیہ السلام نے فرشتوں سے مجادلہ کیا تو یہ مجادلہ بحث اور جھگڑا کرنے کی معنی میں نہیں ہے بلکہ سوال یعنی پوچھنے کی معنیٰ میں ہے، جیسا کہ سورۃ مجادلہ میں ہے۔

"قد سمع الله قول التی تجادلك فی زوجها"

یعنی اللہ رب العزت نے اس عورت کا قول سنا جو آپ سے بار بار سوال کر رہی تھی، تو یہاں بھی یہ مطلب ہے کہ ابراہیم علیہ السلام ان فرشتوں سے بار بار دریافت کر رہے تھے کہ عذاب کی کیفیت کیا ہو گی؟ عام لوگوں پر نازل ہو گا یا خاص گروہ پر؟ اس بار بار استفسار کی بنا پر اس کو مجادلہ کہا گیا ہے۔

بعض علماء کرام فرماتے ہیں کہ یجادلنا فی قوم لوط کا مطلب ہے کہ انہوں نے ہم سے قوم لوط کی سفارش کرنا شروع کر دی کہ اے اللہ ان کو کچھ اور مہلت دی جائے، شاید وہ سمجھ جائیں کیوں کہ "ان ابراهیم لحلیم اواه منیب" بیشک ابراہیم بہت حوصلے والے نرم دل اور اللہ کی طرف انابت و رجوع کرنے والے تھے، انہی اوصاف کی بنا پر قوم لوط کو مہلت دینے کی سفارش کرنے لگے، لیکن ہم نے کہا۔

يَاإِبْرَاهِيمُ أَعْرِضْ عَنْ هٰذَا إِنَّهُ قَدْ جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ وَإِنَّهُمْ آتِيهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُودٍ

(تفسیر خازن ص ۳۶۳)

یعنی اے ابراہیم اس بات کو جانے دو اور ان کی سفارش نہ کرو کیونکہ ان کی ہلاکت کا وقت آچکا ہے اب وہ ہمارے عذاب سے لامحالہ تباہ و برباد ہوں گے، اب ان سے ہمارا عذاب ہر گز نہیں ٹل سکتا۔

Marfat.com

"ان العذاب الذی نزل بھم غیر مصروف عنھم ولا مدفوع عنھم"

اور یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ابراہیم علیہ السلام کو ایسی درخواست عرض کرنے کا حق نہیں تھا۔ کیونکہ اصل چیزوں میں تو اباحت ہے لہٰذا ابراہیم علیہ السلام نے مہلت کا عرض کردیا، باقی من جانب اللہ ان کی تباہی اس وقت مناسب تھی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو روکا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی خاموش ہوگئے۔

(عصمت الانبیاء، جواہر القرآن، خازن)

بحث خامس: کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین جھوٹ بولے ہیں؟

ابراہیم علیہ السلام کے تین جھوٹ ایک یہ کہ بتوں کو توڑا تو خود حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اور نسبت بڑے بت کی طرف کی۔

وضاحت: تو اس کے متعلق علماء کرام کے مختلف جوابات ہیں۔

توجیہ ۱: بل فعلہ میں تکلم سے غیبت کی طرف التفات ہے اور اس کا فاعل مقدر ہے اصل میں تھا بل فعلہ مَنْ فعلہٗ یعنی جس نے یہ کام کیا ہے اس نے تو کر ڈالا، یہ تمہارا بڑا بت بھی موجود ہے، تم اپنے اس معبود سے ہی پوچھ لو کہ ان کیساتھ یہ ماجرا کس نے کیا ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس فعل سے انکار نہیں کیا بلکہ لطیف اور کنائی انداز میں اسے تسلیم کر لیا امام رازی نے اس توجیہ کو اس طرح بیان کیا ہے۔

"انہ کنایۃ عن غیر مذکور ای فعلہ من فعلہ وکبیرھم ھٰذا ابتداء الکلام ویروی عن الکسائی انہ کان یقف عند قولہ بل فعلہ ثم یبتدی کبیرھم ھٰذا"

(تفسیر کبیر ج ۲۲ ص ۱۸۵)

یعنی فاعل ذکر کئے بغیر یہ کنایہ ہے کہ کسی نے تو کر ڈالا، وکبیرھم ھٰذا یہ مستقل کلام ہے، امام کسائی سے روایت کی گئی ہے کہ وہ بل فعلہ پر وقف کرتے تھے اور پھر کبیرھم ھٰذا سے کلام کی ابتداء کرتے تھے۔

توجیہ ۲: یہ ایک اسناد مجازی ہے عربی کا مشہور مقولہ ہے اَنْبَتَ الرَّبِیْعُ الْبَقْلَۃَ

Marfat.com

یعنی موسم ربیع کی بارش نے کھیتی اگائی ہے۔ اگر چہ اُگانے والا در حقیقت حق تعالیٰ ہے مگر اس کو ایک ظاہری سبب کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے، اور اس کو کوئی جھوٹ نہیں کہہ سکتا۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بڑے بت کی طرف اس فعل کو عملاً اور قولاً منسوب کر دینا جھوٹ ہر گز نہیں۔

توجیہ ۳: یہ بطور طنز و تعریض کے کہا گیا ہے یعنی جب یہ بڑا بت ہے تو اسکے ہوتے ہوئے چھوٹوں کا یہ حشر انہیں سے صادر ہوا ہو گا۔

توجیہ ۴: یہ گفتگو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے باعتبار توریہ کی جس کا مطلب یہ ہے کہ الفاظ ایسے بولے جائیں جن کے دو مفہوم ہو سکیں، سننے والا اس سے ایک مفہوم سمجھے اور بولنے والے کی نیت دوسرے مفہوم کی ہو۔ (معارف القرآن ج ٦)

توجیہ ۵: اَنَّهٗ يَجُوْزُ اَنْ يَّكُوْنَ فِيْهِ وَقْفٌ عِنْدَ قَوْلِهٖ كَبِيْرُهُمْ ثُمَّ يُبْدِئُ فَيَقُوْلُ هٰذَا فَاسْئَلُوْهُمْ وَالْمَعْنٰى بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ وَعَنٰى نَفْسَهٗ لِاَنَّ الْاِنْسَانَ اَكْبَرُ مِنْ كُلِّ صَنَمٍ

(تفسیر کبیر ج ۲۴، ص ۱۸۵)

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ پر وقف ہو اور هٰذا فَاسْئَلُوْهُمْ سے نیا جملہ شروع ہوا ہو، نیز فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود اپنا نفس مراد لیا ہو کیونکہ انسان تو ہر صورت میں صنم یعنی بے جان بت سے بڑا ہے۔

دوسری بات کہ میں بیمار ہوں:

فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ۔ فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ

پس (حضرت ابراہیم علیہ السلام) نگاہ کی ایک بار تاروں میں پھر کہا بیشک میں بیمار ہوں۔ اس آیت سے دو اشکال ہوتے ہیں ایک یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نجوم پر اعتقاد رکھتے تھے جبکہ ایسا عقیدہ درست نہیں۔ دوسرا یہ کہ کہا میں بیمار ہوں حالانکہ بیمار تھے نہیں تو جھوٹ بولا۔

وضاحت: توجیہ ۱: پہلے اشکال کی "نظر نظرۃ فی النجوم" یہ محاورہ ہے جس کے معنی غور و فکر کرنے کے ہیں۔

Marfat.com

توجیہ ۲: یہ قوم چونکہ ستارہ پرست تھی اور ستاروں کی مختلف احوال و اوضاع کو نظام عالم میں مؤثر سمجھتی تھی اسلئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بطور ایہام ستاروں کا حساب لگا کر جواب دیا۔

توجیہ ۳: مطلقاً ستاروں کی طرف دیکھ کر اس سے معلومات حاصل کرنا حرام نہیں اسلئے کہ جس کا یہ اعتقاد ہو کہ اللہ تعالیٰ کی عادت کے مطابق جب ستاروں میں ایک اتصال پیدا ہوتا ہے تو اس سے اس عالم میں ایک مخصوص ہنگامہ برپا ہوتا ہے اور یہ بھی اعتقاد ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ستاروں کے اندر ایک ایسی قوت ودیعت رکھی ہے کہ اس قوت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے حکم سے عالم میں ہنگامے وحادثات بپا ہوتے ہیں تو اس عقیدے سے ستاروں کی طرف دیکھنا حرام نہیں ہے۔

توجیہ ۴: یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بذریعہ وحی یہ اطلاع دی گئی تھی کہ جب فلاں ستارہ نکلے گا تو تم بیمار ہو جاؤ گے، چنانچہ جب انہوں نے وہ ستارہ دیکھا تو کہنے لگے میں بیمار ہوں۔

دوسرا اشکال: کہ ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ میں بیمار ہوں حالانکہ وہ اس وقت بیمار نہ تھے۔ علماء کرام نے اسکے جوابات اس طرح دیئے ہیں۔

وضاحت: توجیہ ۱: حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ میں بیمار ہو جاؤں گا جیسا کہ کسی کو قرائن سے یہ پتہ چلے کہ ظہر کے وقت مجھے بخار آگھیرے گا اور پھر کوئی اس کو ظہر کے وقت دعوت کے لئے پہلے سے دعوت نامہ ارسال کرے تو جواب میں وہ کہہ دے کہ میں بیمار ہوں یعنی اس وقت تک میں بیمار ہو جاؤں گا۔

توجیہ ۲: آنے والے زمانے کے اعتبار سے اپنے آپکو بیمار کہا گیا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے انك ميت وانهم ميتون۔ یعنی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر بھی موت ہے (مستقبل میں) اور دوسروں پر بھی موت ہے یعنی مستقبل میں۔

توجیہ ۳: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے لفظ سقیم سے کفر سے بیزاری مراد لی تھی۔

اول سقیم النفس یعنی بیزار اَرادانّی سَقِیمٌ لِکُفرِکُم۔ (مدارک ج ۴ ص ۷۰ مکتبہ علمیہ لاہور)

Marfat.com

یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس لفظ سے مراد لیا کہ میں تمہارے کفر و شرک کی وجہ سے تم سے بیزار ہوں اور تمہاری عید میں شریک نہیں ہو سکتا، لیکن مشرکین اس سے جسمانی مرض سمجھے اس اسلوب کلام کو تعریض یا توریہ کہا جاتا ہے جو حقیقت میں صحیح اور واقعہ کے مطابق ہوتا ہے۔ لیکن بظاہر جھوٹ معلوم ہوتا ہے۔

توجیہ ۴: "انی سقیم" میں علالت طبع کا ذکر ہے جس کو ابراہیم علیہ السلام ہی خوب جان سکتے ہیں کہ وہ کیا بیمار ہیں، اس میں دوسرے کو خواہ مخواہ شک اور تردد کا کونسا موقع ہے۔ حتیٰ کہ اگر ایک شخص ظاہر بین نگاہوں میں تندرست نظر آتا ہو تب بھی ضروری نہیں کہ وہ واقعی تندرست ہے، ہو سکتا ہے کہ اس کا مزاج کسی وجہ سے حد اعتدال پر نہ ہو اور ایسی تکلیف میں مبتلا ہو جس کا اظہار کیئے بغیر دوسرا اس کو نہ سمجھ سکے۔

تیسری بات کہ اپنی بیوی حضرت سارہ علیہا السلام کو اپنی بہن بتایا۔

اس تیسری بات کا تذکرہ قرآن کریم سے ثابت نہیں ہے بلکہ متعدد احادیث کی روشنی میں ان تینوں باتوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ کسی حدیث میں تفصیل سے اور کسی حدیث میں اجمال سے یہ واقعے مذکور ہیں۔

حضرت علامہ سیوہارویؒ یوں بیان فرماتے ہیں: صحیح بخاری کی روایت اس طرح شروع ہوتی ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جب مصر سے گزر ہوا تو انہوں نے مصر پہنچنے سے پہلے اپنی زوجہ مطہرہ حضرت سارہ علیہا السلام سے یہ فرمایا کہ یہاں کا بادشاہ جابر و ظالم ہے اگر کسی حسین عورت کو دیکھتا ہے تو اس کو زبردستی چھین لیتا ہے اور اس کے ساتھ مرد کو اگر وہ اس عورت کا شوہر ہے تو قتل کر ڈالتا ہے اور اگر کوئی دوسرا عزیز ہے تو اس سے کوئی تعرض نہیں کرتا، تم چونکہ میری دینی بہن ہو اور اس سرزمین میں میرے تمہارے علاوہ دوسرا کوئی مسلمان نہیں ہے اسلئے تم اس سے کہہ دینا کہ یہ میرا بھائی ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور جب شب میں اس نے ارادہ بد کیا تو اس کا ہاتھ شل ہو کر رہ گیا اور وہ کسی طرح حضرت سارہ کو ہاتھ نہ لگا سکا، یہ دیکھ کر اس نے سارہؓ سے کہا اپنے خدا سے

Marfat.com

دعا کر کہ میرا ہاتھ درست ہو جائے تو تجھ کو رہا کر دوں گا۔ سارہ نے دعا کی مگر اس نے پھر ارادہ بد کیا، دوبارہ اس کا ہاتھ شل ہو گیا تیسری مرتبہ پھر یہی تمام قصہ پیش آیا ۔تب اس نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ یہ "جن" ہے انسان نہیں ہے۔ اس کو میرے پاس سے جلد لے جاؤ اور ساتھ ہی ہاجرہ کو حوالے کر کے کہا کہ اس کو بھی اپنے ساتھ لے جائیں نے تیرے حوالہ کیا جب سارہؓ ہاجرہؓ کو ساتھ لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس پہنچیں تو انہوں نے حال دریافت کیا اور سارہؓ نے مبارکباد دی اور کہا، شکر ہے خدائے عزوجل کا کہ اس نے ہم کو اس فاسق و فاجر سے نجات دی اور آپ کیلئے ایک خادمہ ساتھ کر دی۔ حضرت ابوہریرہؓ نے یہ حدیث نقل کر کے فرمایا "اے شریف النسب اہل عرب یہ ہیں وہ ہاجرہ جو تم سب کی ماں ہے۔"

یہ حدیث مختلف طریقوں سے کتب احادیث میں منقول ہے اس کے علاوہ بخاری میں ایک اور طویل حدیث موجود ہے جو حدیث شفاعت کے نام سے موسوم ہے اور متعدد ابواب بخاری مثلاً سورہ بقرہ کی تفسیر کے باب میں کتاب الاستر قاق میں، اور کتاب التوحید میں مذکور ہے، اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جو تذکرہ ہے اس کا حاصل یہ ہے۔

میدان حشر میں جب سب مخلوق آدم و نوح علیہما السلام اور دوسرے انبیاء سے شفاعت کیلئے کہہ چکی ہو گی تو حضرت ابراہیم کے پاس پہنچے گی اور ان سے کہے گی کہ آپ خلیل الرحمان ہیں آپ ہماری سفارش بارگاہ الٰہی میں کیجئے کہ جلد فیصلہ ہو، تو وہ فرمائیں گے کہ مجھ کو شرم آتی ہے اسلئے کہ میں نے دنیا میں تین جھوٹ باتیں کی تھیں "انی سقیم"، "بل فعلہ کبیرھم" اور اپنی بیوی سے کہا تھا کہ "انی اخوک"۔

بخاری کے علاوہ یہ روایت مسلم، مسند احمد، صحیح ابن خزیمہ، مستدرک، حاکم، معجم طبرانی، مصنف ابن ابی شیبہ، ترمذی، اور مسند ابی عوانہ میں مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے۔

یہ روایت کتب حدیث میں اجمال و تفصیل کے ساتھ مختلف طریقوں سے

Marfat.com

روایت کی گئی ہے بعض میں صرف اجمالی طور پر اس قدر تذکرہ ہے کہ ہر نبی اس وقت اپنی لغزش کو بیان کر کے معذرت کریں گے کہ وہ شفاعت نہیں کر سکتے اور بعض میں ابراہیم علیہ السلام کے جواب میں فقط "ثلث کذبات" ہی کا ذکر ہے اور بعض روایات میں ان تینوں کی تفصیل ہے اور ان ہی میں سے بعض روایات میں یہ تصریح بھی موجود ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابراہیم علیہ السلام کے ان تینوں جھوٹ میں سے ہر ایک صرف اللہ تعالیٰ کے دین کی مدافعت و حمایت ہی کیلئے بولا گیا ہے۔

بہر حال یہ دونوں روایات صحیح (بخاری و مسلم) کی روایات میں جو ہر قسم کے سقم روایت سے پاک اور صاف ہیں، یہ روایات ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر اور جد انبیاء کی جانب "کذب" کی نسبت کر رہی ہیں اگرچہ انہی روایات کے بعض طریق روایت نے یہ صاف کر دیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر "کذب" سے مراد وہ عام معنی نہیں لیے جو اخلاقی بول چال میں نہایت شنیع اور گناہ کبیرہ میں شمار ہیں، بلکہ اس کے برعکس یہ واضح کیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے یہ تینوں باتیں نہ ذاتی غرض کیلئے کہی ہیں اور نہ دنیوی مصلحت کے پیش نظر، بلکہ معاندین حق کے مقابلے میں خالص اللہ تعالیٰ کے دین کی حمایت میں کہی ہیں اس کے باوجود جو بات دل میں کھٹکتی اور قلب پر ایک بھاری بوجھ محسوس ہوتی ہے وہ حدیث کی یہ تعبیر ہے۔

یہ تسلیم کہ روایت کے بعض تصریحات نے اس کو "کذب" کے عام معنی سے جدا کر دیا، تاہم اول تو یہ "زیادت" صحیحین میں مذکور نہیں اگرچہ صحیح روایت میں موجود ہے، دوسرے جبکہ "صدق لسانی" انبیاء علیہم السلام کی غیر منفک اور عصمت نبی کیلئے ایک ضروری صفت ہے نیز جبکہ خصوصیت کے ساتھ قرآن عزیز نے ابراہیم علیہ السلام کے متعلق حسب ذیل امتیازات کا صراحت کے ساتھ ذکر فرمایا ہے پھر ان کے ساتھ صورۃً بھی کذب کی نسبت کیسی؟

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا (سورۃ مریم ١٩، آیت ٤١)

Marfat.com

اور یاد کر کتاب میں ابراہیم کا ذکر بے شک تھا وہ صدیق (صادق النفس) نبی "صدیق" مبالغہ کا صیغہ ہے اور اسی ہستی پر اس کا اطلاق کیا جاتا ہے کہ "صدق" جس کی ذاتی اور نفسیاتی صفت ہو۔

اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِیْفًا ؕ وَلَمْ یَكُ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (۱۲۰) شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (سورۃ النحل، آیت ۱۲۰۔۱۲۱)

بیشک ابراہیم تھا راہ ڈالنے والا حکم بردار، خالص اللہ کی طرف جھکنے والا اور نہ تھا وہ مشرکوں میں سے خدا کی نعمتوں کا شکر گذار تھا، خدا نے اسکو چن لیا تھا اور سیدھی راہ کی اس کو ہدایت دی۔

مجتبیٰ اور مہدی ایسی صفات ہیں کہ جن کے ساتھ کذب نہ حقیقتاً جمع ہو سکتا ہے اور نہ صورۃً

ثُمَّ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (النحل، آیت ۱۲۳)

(اے محمد ﷺ) پھر ہم نے تیری طرف وحی بھیجی کہ تو ملۃ ابراہیم کی پیروی کر جو ابراہیم خالص خدا کی جانب جھکنے والا ہے۔

یہ وہ ابراہیم ہے جن کی ملۃ کی اقتداء اور پیروی کا حکم محمد رسول اللہ ﷺ اور ان کی امت مرحومہ کو دیا جا رہا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَاۤ اِبْرٰهِیْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِیْنَ (الانبیاء، آیت ۵۱)

اور بلاشبہ ہم نے ابراہیم کو رشد وہدایت شروع ہی سے بخش دی تھی اور ہم ہی اسکو جاننے والے ہیں۔

یہ اور اسی قسم کی بہت سی آیات حضرت ابراہیم کی ان خصوصی صفات کا ذکر کرتی اور نصوص قطعیہ پیش کرتی ہیں کہ جن کے بعد ایک لمحہ کیلئے بھی اس جیسی مقدس اور جلیل القدر ہستی کے متعلق "کذب" کا تصور نہیں ہو سکتا، چہ جائیکہ وقوع اور عمل "خواہ وہ کذب حقیقی معنی میں ہو یا محض کذب کی صورت میں"۔

Marfat.com

زیر بحث مسئلہ: اس مقام پر پہنچ کر ایک مرتبہ پھر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ مسئلہ زیر بحث یہ نہیں ہے کہ "العیاذ باللہ" ابراہیم نے واقعی جھوٹ بولا کیونکہ قرآن عزیز کی قطعی نصوص اور زیر بحث روایات کے علاوہ احادیث نصوص ابراہیم علیہ السلام کو نبی، پیغمبر اور رسول بتاتی ہے اور ان کی امتیازی صفات صدیق مجتبیٰ، مہدی نبی، حنیف اور رسول ثابت کرتی ہے۔ نیز زیر بحث روایت میں بھی یہ واضح ہے کہ ان کے یہ کلمات خدا کے دین کی حماعت و مدافعت کیلئے تھے، نہ کہ کسی دنیوی غرض و مصلحت سے، لہٰذا ایک لمحہ کیلئے بھی اس میں تردد کی گنجائش نہیں ہے۔ "کذب" ان سے اسی طرح دور ہے جس طرح دن سے رات اور روشنی سے تاریکی اور بلاشبہ وہ ایک نبی معصوم ہیں اور ہر قسم کی معصیت و گناہ سے پاک ہیں۔

البتہ زیر بحث مسئلہ یہ ہے کہ ان دو صحیح روایات میں ان تینوں باتوں کے متعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے جلیل القدر پیغمبر کے بارہ میں "کذب" کی تعبیر کیوں فرمائی جبکہ آپکی ذات اقدس ضروریات دین اور عقائد اسلامی کے بارہ میں ابہام اور گنجلک کو دور کرنے کا باعث ہے، نہ کہ ابہام و التباس پیدا کرنے کا خصوصاً جبکہ یہ تینوں باتیں خود اپنی جگہ کسی حال میں نہ صورت میں کذب ہیں اور نہ حقیقی معنیٰ میں۔

بلاشبہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دینی بہن تھیں اور بیوی کے رشتے سے اسلامی اخوت کا رشتہ منقطع نہیں ہو جاتا، نیز ابن کثیر اور دوسرے مورخین کی تحقیق میں ان کے چچا حاران کی بیٹی تھی، اسلئے چچازاد بہن بھی تھیں، اور بلاشبہ ان کا مزاج ناساز تھا گو سخت بیماری نہ سہی اسلئے "انی سقیم" ہر حیثیت سے صحیح ہے اور بلاشبہ انہوں نے مناظرانہ طرز خطابت میں دشمن کو لاجواب کرنے کیلئے فرمایا "بل فعلہ کبیر ھم" اور یہ علمی دنیا میں کسی حیثیت سے بھی جھوٹ نہیں تھا، تو پھر ان پر دو احادیث میں اس طرح کی تعبیر کیوں اختیار کی گئی؟

اس کے متعلق جاننا چاہیے کہ یہ قطعی اور یقینی عقیدہ ہے کہ نبی اور رسول کی جانب "کذب" کی نسبت کسی حال میں درست نہیں ہے ایسی صورت میں اگر مستند

Marfat.com

اور صحیح روایات میں جو کہ حد شہرت کو پہنچ چکی ہوں ان قسم کی کوئی نسبت موجود ہو جو نبی کی نبوت کے شان کے منافی ہو تو ان روایات کو صحیح مانتے ہوئے ان خصوصی جملوں کی ایسی توجیہ کرنی چاہئے جس سے اصل مسئلہ پر بھی زد نہ پڑے اور صحیح روایات کا انکار بھی لازم نہ آئے، پس چونکہ صحیحین کی یہ روایات "تلقی بالقبول" کی وجہ سے صحت اور شہرت کے اس درجہ اور مرتبہ کو پہنچ چکی ہیں جو اخبار احاد میں شمار نہیں ہو سکتیں اسلئے ان روایات کو مردود قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ "ثلث کذبات" کے جملہ کی یہ توجیہ کرنی چاہئے کہ اس مقام پر کذب سے مراد یہ ہے کہ "ایسا کلام جو صحیح اور پاک مقصد کیلئے بولا گیا ہو لیکن مخاطب اس کا وہ مطلب نہ سمجھے جو متکلم کی مراد ہے بلکہ ان الفاظ کو اپنی ذہنی مراد کے مطابق سمجھے" اور یہ معنی صرف ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کیلئے ہی نہیں تراشے گئے بلکہ علم بدیع کی اصطلاح میں اس کو "معاریض" کی اقسام میں شمار کیا گیا ہے اور فصحاء وبلغاء کے کلام میں اکثر رائج ہے۔

اس طرح روایات کا انکار بھی لازم نہیں آئے گا اور صداقت نبی کا مسئلہ بھی اپنی جگہ بغیر کسی غل وغش کے صحیح رہے گا، چنانچہ حدیث شفاعت کے وہ الفاظ،

"ما منها کذبة الا ماحل به عن دین الله"

ہماری اس توجیہات کی تائید کرتے ہیں، جمہور علماء اسلام کی یہی رائے ہے۔

(عصمت انبیاء، معارف القرآن، جواہر القرآن، قصص القرآن)

Marfat.com

ابحاث حضرت یعقوب علیہ السلام کے متعلق

پہلی بحث: حضرت یعقوب علیہ السلام کا حضرت یوسف علیہ السلام سے زیادہ محبت کرنا

یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اتنی بڑی محبت کیوں کی اور دوسرے بھائیوں پر ان کو الفت و محبت اور قرب کے اعتبار سے ترجیح کیوں دی جبکہ ان کو معلوم بھی تھا کہ اس ترجیح سے ان کے بھائیوں میں حسد ہو گا اور بڑے مفاسد پیدا ہوں گے۔

توجیہ ۱: تفسیر مظہری میں حضرت قاضی ثناءاللہ پانی پتی نےؒ اس اشکال کو ذکر کر کے حضرت مجدد الف ثانیؒ کی ایک خاص تحقیق نقل فرمائی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بلاشبہ دنیا اور متاع دنیا کی محبت مذموم ہے قرآن وحدیث کی نصوص بے شمار اس پر شاہد ہیں مگر دنیا میں جو چیزیں آخرت سے متعلق ہیں ان کی محبت در حقیقت آخرت ہی کی محبت میں داخل ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے کمالات صرف حسنِ صورت ہی نہیں بلکہ پیغمبرانہ عفت اور حسنِ سیرت بھی ہے۔ اس مجموعہ کی وجہ سے ان کی محبت دنیاوی سامان کی محبت نہ تھی بلکہ در حقیقت آخرت ہی کی محبت تھی۔

توجیہ ۲: محبت چونکہ اضطراری ہوتی ہے اور رونا بھی رقتِ قلب اور رحمدلی کی دلیل ہے اسلئے حضرت یعقوب علیہ السلام کا مخلوق کی محبت میں اس درجہ رونا باعث اشکال نہیں ہونا چاہئے۔ بالخصوص جبکہ محبت کا سبب کوئی دینی پہلو ہو جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا برگزیدہ ہونا۔

توجیہ ۳: حضرت یعقوب علیہ السلام کی یہ ترجیح طبعی اور دلی محبت کی وجہ سے تھی اور

Marfat.com

قدرت سے باہر ہونے کی وجہ سے انسان اس کا مکلف قرار نہیں دیا گیا ہے جیسے آپ ﷺ کی محبت طبعاً تمام امہات المومنین رضی اللہ عنہن کی بنسبت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ تھی، یہ محبت بھی آپ ﷺ کی غیر اختیاری تھی یہ بھی کسی طرح معیوب نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

توجیہ ۴: حضرت یعقوب علیہ السلام کو یہ علم نہ تھا کہ اس سے مفاسد پیدا ہونگے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ نے بیٹوں کی ظاہری خوش خلقی دیکھ کر یہ سمجھا ہو کہ ترجیح اتنے بڑے المیہ کا سبب نہیں بنے گی۔

دوسری بحث: جب حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق خطرہ بھی تھا تو پھر کیوں ساتھ بھیجا؟

حضرت یعقوب علیہ السلام کو جب یوسف علیہ السلام کے متعلق خطرہ تھا جیسے فرمایا:

﴿ وَاَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس کو بھیڑیا نہ کھا جائے تو پھر بھائیوں کے ساتھ حضرت یوسف کو کیوں روانہ کیا۔﴾

وضاحت: حضرت یعقوب علیہ السلام نے جب بیٹوں کی قسموں اور ان کی طرف سے حفاظت کے مضبوط عہد کو دیکھا تو مطمئن ہوئے یہ بات قرآن کریم کی ان ہی آیات سے معلوم ہوتی ہیں۔ (استفادہ: معارف القرآن، کمالین شرح جلالین، عصمت انبیاء)

تیسری بحث: حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے لڑکوں کو جھوٹا سمجھنے کے باوجود حضرت یوسف علیہ السلام کی تلاش کیوں نہیں کی؟

بھائیوں کی طرف سے یوسف علیہ السلام کے خون آلودہ کرتہ دکھانے اور یوسف علیہ السلام کے ضایع ہونے کی خبر ملنے پر جب یعقوب علیہ السلام نے دلائل یا غالب گمان سے یقین کیا کہ حضرت یوسف کو بھیڑیے نے نہیں کھایا تو پھر حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف کی تلاش کیوں نہ کی؟ ایسے صبر میں تو دوسرے کی جان جانے کا اندیشہ تھا۔

Marfat.com

وضاحت: ہو سکتا ہے وحی کے ذریعے حضرت یعقوب علیہ السلام کو اطمینان ہو گیا ہو کہ حضرت یوسف اس طرح ضایع نہیں ہونگے، اور چونکہ قسمت میں یہ لمبی دوری مقدر تھی اسلئے اس کی تلاش کی طرف دھیان ہی نہ گیا ہو یا اس تلاش کو بے سود سمجھا ہو۔ (استفادہ: کمالین شرح جلالین)

چوتھی بحث: حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں تجربہ رکھنے کے باوجود بن یامین کو انکے ساتھ کیوں روانہ کیا؟

حضرت یعقوب علیہ السلام کو ان بیٹوں کا ایک دفعہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں تجربہ ہو چکا تھا پھر بنیامین کو ان کے ساتھ کیوں بھیجا؟

وضاحت: بنیامین کو نہ بھیجنے کے صورت میں غلہ نہ ملتا، اسلئے نقصان یقینی تھا اور بھیجنے کی صورت میں نقصان کا احتمال تھا۔ اسلئے احتمال نقصان کو یقینی نقصان پر ترجیح دی اور قسم وغیرہ سے اس احتمال کا تدارک بھی کیا۔ (کمالین شرح جلالین)

پانچویں بحث: حضرت یعقوب علیہ السلام کے لڑکوں کا اپنے باپ کو لفی ضلال مبین کہنا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے تمام بیٹے اپنے باپ کو جو پیغمبر بھی ہے لَفِي ضَلٰلٍ مُبِيْنٍ یعنی واضح گمراہی میں کہتے ہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پیغمبر گمراہ ہو؟

وضاحت: حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے اپنے باپ کیلئے جو لفظ استعمال کئے ہیں قرآن کریم ان کو اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِ

جب انہوں نے کہا کہ یوسف اور اسکا بھائی (بنیامین) ہمارے ابا جان کو ہم سے زیادہ پیارے ہیں حالانکہ ہم ایک جماعت (قوت) ہیں بیشک ہمارے ابا جان صریح غلطی میں ہیں۔ (سورہ یوسف)

Marfat.com

ضلال کے معنی مختلف ہیں ایک معنی ہے نظریاتی اعتبار سے دین حق، توحید ربانی اور انبیاء علیہم السلام کے نبوت سے انکار کرنا، اس سے عدول کرنا، دوسری معنی ہے کسی بات کو بھول جانا جیسے فرمایا اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى (سورۃ البقرہ)

یعنی اگر ان دونوں گواہ عورتوں میں سے ایک بھلا لے تو دوسری یاد دلائے، تیسری معنی ہے کسی خیال اور رائے سے عدول کرنا اور پھر جانا، یہاں یہی معنی مقصود ہے انکے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے والد محترم ہم سے پیار اور محبت کو چھوڑ کر یوسف اور اس کے سگے بھائی سے جو زیادہ پیار و محبت کرتا ہے تو اس میں وہ غلطی کر رہے ہیں ہم سے یہ برداشت نہیں ہو رہا۔

غرض یہ کہ بیٹوں کا مقصد ضلال کے لفظ سے دین سے گمراہی والی معنی ہر گز نہ تھی، ایسا خیال کرنے سے سب کے سب کافر ہو جاتے کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر ہیں اور ان کی شان میں ایسا خیال کرنا قطعی کفر ہے۔

(استفادہ: معارف القرآن)

اس قصہ کے آخر میں آیت ۹۵ میں فرمایا

لوگ بولے قسم اللہ کی آپ تو اپنی پرانی غلطی میں ہیں۔(سورہ یوسف)

اس آیت کے سیاق وسباق سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ مقولہ بیٹوں کا نہیں ہے کیونکہ اس وقت وہ مصر سے واپسی کے سفر میں تھے تو کہنے والے خاندان کے اور لوگ ہوں گے۔

اس آیت میں بھی ضلال کی معنیٰ غلطی مراد ہے۔

قال ابنُ عباس لَفِيْ خَطَئِكَ الْقَدِيْمِ وَقَالَ قَتَادَةُ اَيْ مِنْ حُبِّ يُوْسُفَ لَاتَنْسَاهُ وَلَا تَسْلَاهُ (ابن کثیر)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کے متعلق کہتے ہیں کہ یقیناً آپ اپنی پرانی غلطی میں ہیں اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں مطلب ہے کہ یوسف کی محبت میں جو (آپ مستغرق) ہیں تو آپ اسکو بھلا نہیں سکتے۔

Marfat.com

چوتھی معنی: ضلال کے معنی گم ہونا بھی ہے جیسے عرب بولتے ہیں
ضَلَّ الماءُ فِی اللَّبَنِ یعنی پانی دودھ میں گم ہو گیا۔ تو حضرت یعقوب علیہ السلام یوسف علیہ السلام کی محبت میں گم ہو گئے تھے۔

جیسے مصر کی عورتوں نے عزیز مصر کی بیوی کے متعلق کہا تھا

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِی الْمَدِیْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِیْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۳۰﴾ (سورۃ یوسف:۳۰)

یعنی وہ اپنے غلام کو نہکار ہی ہے وہ غلام پر دل سے فریفتہ ہے ہم اسکو کھلی ہوئی دیوانگی میں دیکھ رہی ہیں، اہم اسکو (محبت یوسف میں) واضح انداز میں گم دیکھ رہی ہیں۔
اگرچہ عزیز مصر کی بیوی کے متعلق ضلال کے لفظ سے گمراہی کی معنی مراد لی جائے تو کوئی حرج نہیں، لیکن کردار اور افعال کے اعتبار سے محبت میں گم ہونا اور دیوانہ، زیادہ لائق ہے۔

چھٹی بحث: حضرت یعقوب علیہ السلام کا حضرت یوسف علیہ السلام کے فراق میں اتنا رونا کہ نظر بھی چلی گئی کیا یہ بے صبری نہیں؟

حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کے فراق میں غم وگریہ اتنا زیادہ کیونکر کیا جو ان کی نظر بھی جاتی رہی۔ انبیاء علیہم السلام کو تو مصائب بڑی ہمت اور خندہ پیشانی سے برداشت کرنا چاہئے نیز جب حضرت یعقوب علیہ السلام کو اپنے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام کے دیکھے ہوئے خواب کے ذریعے معلوم بھی ہو چکا تھا کہ ان کو بڑا مقام ملنا ہے تو انہوں نے اس سے غم کم کرنے کا سامان کیوں نہ کیا؟

وضاحت: توجیہ ا: مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا اور غم کو پی جانا مستحب ہے واجب نہیں ہے اور مستحب کو چھوڑنا گناہ نہیں ہے، تاہم انہوں نے غم والم اور حزن کا اکثر حصہ چھپا کر رکھا تھا۔ (عصمت الانبیاء)
توجیہ ۲: جدائی سے جو غم لاحق ہوا تھا وہ اس ظنی علم سے کیسے کافور ہو اور اس

Marfat.com

خواب کو دیکھتے وقت حضرت یوسف علیہ السلام چھوٹے بھی تھے، شاید اس وجہ سے یعقوب علیہ السلام نے اس خواب کی صحت پر یقین نہ کیا ہو۔(عصمت الانبیاء)

توجیہ ۳: غم و حزن اور فکر انسان کا طبعی معاملہ ہے اور یہ قابل مؤاخذہ نہیں ہے لہذا حضرت یعقوب علیہ السلام بھی طبعی طور اس پریشانی اور دکھ میں مبتلا رہے۔ لہذا طبعی پریشانی صبر کے منافی نہیں ہے جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے فرزند ارجمند حضرت ابراہیم کے انتقال کے وقت رو پڑے اور آپ کے آنسو نکل آئے تو آپ نے اسکو بے صبری میں شمار نہیں کیا۔ واللہ اعلم بالصواب

ساتویں بحث: حضرت یعقوب علیہ السلام کا انما اشکو بثی وحزنی الی اللہ کہنا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کا کہنا، "انما اشکوا بثی وحزنی الی اللہ" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے بے صبری کی ہے حالانکہ اس سے پہلے "فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ" کہہ چکے ہیں تو یہ کیسے ہے۔

وضاحت: حضرت یعقوب علیہ السلام کا "انما اشکوا بثی" کہنا "فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ" کے خلاف نہیں ہے کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے مخلوق کے آگے شکایت نہیں کی لہذا صبر میں کوئی خلل نہیں پڑا۔ اور "اشکو بثی وَحُزْنِي" یہ تو اللہ رب العزت کے حضور میں پکارنا ہے، تو یہ عین دعا و التجا ہے اور یہی مطلوب ہے۔(استفادہ: کمالین)

آٹھویں بحث: حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف سے بھائیوں کو پہلی مرتبہ واپس کی ہوئی مالیت حضرت یعقوب علیہ السلام نے کیوں قبول کی؟

یوسف علیہ السلام کی طرف سے پہلی مرتبہ واپس کی ہوئی مالیت کو حضرت یعقوب علیہ السلام نے کیسے قبول کیا؟ غیر واضح مال اور قابلِ اشتباہ تھا، بیٹوں سے کیوں نہ کہا کہ یہ مال مصر کے حکمران کو واپس دیدو!

وضاحت: جب کسی دوسرے شخص کا مال یا کوئی چیز اپنے سامان میں سے نکلے اور

Marfat.com

قرائن قویہ اس پر شاہد ہوں کہ اس نے بالقصد ہمیں دینے ہی کیلئے ہمارے سامان میں باندھ دیا ہے تو اس کو اپنے لئے رکھنا اور اس میں تصرف کرنا جائز ہے۔

یہاں حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے سامان سے برآمد ہونے والی مالیت اس نوعیت کی تھی، انہوں نے دلائل و قرائن سے معلوم کیا کہ کسی بھول یا نسیان سے ایسا نہیں ہوا ہے بلکہ قصداً اس مال کو واپس کیا گیا ہے، اسلئے حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس مالیت کو واپس کرنے کی ہدایت نہیں فرمائی۔ (استفادہ: معارف القرآن)

Marfat.com

ابحاث حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق

پہلی بحث: حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنی مصنوعی غلامی دکھانا

جب من گھڑت کے انداز میں یوسف علیہ السلام کو بھائیوں نے غلام بنا کر قافلہ والوں کو فروخت کیا تو اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی حُریت و آزاد ہونے کی بات قافلہ والوں کو کیوں نہ کی؟ اپنے آپ کو غلامی میں رکھنا تو گناہ کا عمل ہے۔

وضاحت: توجیہ ۱: جان کیلئے اگر خطرہ ہو تو مصنوعی غلامی دکھانا جائز ہے حضرت یوسف علیہ السلام کیلئے اس وقت حالات کچھ ایسے ہی تھے۔

توجیہ ۲: اظہارِ حریت کا مسئلہ مختلف شرائع میں الگ الگ حیثیت رکھتا ہے ممکن ہے کہ امتحان کے طور پر خاموش رہنے کا حکم دیا گیا ہو۔

توجیہ ۳: یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی حریت کی خبر دی ہو اور انہوں نے توجہ نہ دی ہو۔ (عصمت الانبیاء)

دوسری بحث: حضرت یوسف علیہ السلام کو عورت کا بلانا

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ۚ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ ۖ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُونَ ﴿۲۳﴾ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ ۖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهِ ۚ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَاءَ ۚ (سورہ یوسف ۲۳۔۲۴)

ترجمہ: اور پھسلایا اس کو اُس عورت نے جسکے گھر میں تھا اپنا جی تھامنے سے، اور

بند کر دیئے دروازے اور بولی شتابی کر، کہا اللہ کی پناہ وہ (عزیز مصر) مالک ہے میرا اچھی طرح رکھا ہے مجھ کو بیشک بھلائی نہیں پاتے جو لوگ بے انصاف ہوں۔ اور البتہ عورت نے فکر کیا اُسکا اور اُس نے فکر کیا عورت کا اگر نہ ہوتا یہ کہ دیکھے قدرت اپنے رب کی، یوں ہی ہوا تاکہ ہٹائیں ہم اس سے بُرائی اور بے حیائی۔ (ترجمہ شیخ الہند)

حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کے متعلق اِنَّہٗ رَبِّیۡٓ اَحۡسَنَ مَثۡوَایَ کا لفظ کیوں استعمال کیا جبکہ یہ لفظ موہم شرک ہے ایک پیغمبر کو ایسا لفظ استعمال کرنا مناسب نہیں ایک حدیث میں ہے کہ کوئی غلام بھی اپنے آقا کو رب نہ کہے اور کوئی آقا اپنے غلام کو اپنا بندہ نہ کہے۔

وضاحت: توجیہ ا: یہ خصوصیت شریعت محمدیہ ﷺ کی ہے جس میں شرک کی ممانعت کے ساتھ ایسی چیزوں کی بھی ممانعت کر دی گئی ہے جس میں ذریعہ شرک بننے کا احتمال ہو سابقین انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں شرک سے تو سختی کے ساتھ روکا گیا تھا لیکن اس کے اسباب و ذرائع پر پابندی نہ تھی، یہ ہی وجہ ہے کہ پچھلی شریعتوں میں تصویر سازی ممنوع نہ تھی۔ مگر شریعت محمدیہ ﷺ چونکہ قیامت تک کیلئے آئی ہے، اسلئے اسکو شرک سے پوری طرح محفوظ کرنے کیلئے شرک کے ذرائع، تصویر اور ایسے الفاظ سے بھی روک دیا گیا جو موہم شرک ہو سکیں، لہٰذا حضرت یوسف علیہ السلام کا اِنَّہٗ رَبِّیۡ فرمانا اپنی جگہ درست تھا۔

توجیہ ۲: اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اِنَّہٗ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو اور حضرت یوسف علیہ السلام کا مقصود اللہ رب العزت ہی ہو کہ اسی نے میرے لئے اسباب بنائے، درحقیقت اسی اللہ تعالیٰ نے اچھا ٹھکانہ دیا ہے اسکی نافرمانی سب سے بڑا ظلم ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ظلم کرنے والوں کو فلاح نہیں ہے اس صورت میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ (معارف القرآن، جواہر القرآن)

Marfat.com

تیسری بحث: کیا حضرت یوسف علیہ السلام نے ارادہ کیا تھا؟

وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَن رَّأَىٰ بُرْهَانَ رَبِّهِ ۚ (سورہ یوسف ۲۴)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کو برائی سے بچنے کا عزم و پختہ ارادہ نہ تھا، حالانکہ پیغمبر کی شان تو یہ ہے کہ گناہ کا تصور بھی نہ آئے اور یوسف علیہ السلام کا یہ کہنا:

وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُن مِّنَ الْجَاهِلِينَ ﴿٣٣﴾ (سورہ یوسف ۳۳)

ترجمہ: اور اگر تو نہ دفع کریگا مجھ سے ان کا فریب تو مائل ہو جاؤں گا ان کی طرف اور ہو جاؤں گا بے عقل۔ (ترجمہ شیخ الہند)

اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کا اعتراف ہے کہ میں گناہ میں مبتلا ہو جاؤں گا تو معلوم ہوا کہ حضرت یوسف میں عزم و استقلال نہیں تھا۔ اور یہ شانِ نبوت کے خلاف ہے۔

وضاحت: جہاں تک انبیاء علیہم السلام کے گناہ میں ملوث ہونے کی بات ہے تو اس کے متعلق عرض ہے کہ جمہور امت اس بات پر متفق ہے کہ انبیاء علیہم السلام صغیرہ اور کبیرہ ہر طرح کے گناہ سے معصوم ہوتے ہیں۔ کبیرہ گناہ تو نہ قصداً ان سے ہو سکتا ہے نہ سہواً نہ خطأً، البتہ صغیرہ گناہ سہواً و خطأً کے طور پر سرزد ہو جانے کا امکان ہے، مگر اس پر بھی انبیاء علیہم السلام کو قائم نہیں رہنے دیا جاتا بلکہ متنبہ کر کے اس سے ہٹا دیا جاتا ہے۔

(معارف القرآن ج ۵ ص ۴۸)

وضاحت: توجیہ ۱: اب آتے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام کے هَمَّ یعنی خیال کی طرف تو حضرت یوسف علیہ السلام کو جو خیال پیدا ہوا وہ گناہ کے درجے کا خیال نہ تھا، عربی زبان میں لفظ هَمَّ دو معنی کیلئے بولا جاتا ہے۔

ایک کسی کام کا قصد و ارادہ اور عزم کر لینا۔

دوسرے محض دل میں وسوسہ اور غیر اختیاری خیال پیدا ہو جانا۔

پہلی صورت گناہ میں داخل اور قابل مؤاخذہ ہے پھر بھی اگر قصد و ارادہ کے بعد خالص اللہ تعالیٰ کے خوف سے کوئی شخص اس گناہ کو اپنے اختیار سے خود چھوڑ دے تو

Marfat.com

حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے گناہ کی جگہ اس کے اعمالنامہ میں ایک نیکی درج فرمادیتے ہیں۔

باقی دوسری صورت محض وسوسہ اور خیال کی ہے، اس میں فعل کا ارادہ بالکل نہیں ہوتا جیسے گرمی کے دن میں روزہ میں ٹھنڈے پانی کی طرف طبعی میلان ہوتا ہے حالانکہ اس روزیدار کو پینے کا ارادہ قطعی نہیں ہوتا یہ خیال غیر اختیاری ہوتا ہے اور اس پر مؤاخذہ کوئی نہیں اس میں گناہ نہیں ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کیلئے گناہ کے وسوسے اور خیال کو معاف کر دیا ہے جبکہ وہ اس پر عمل نہ کرے اور صحیحین میں بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ میرا بندہ جب کسی نیکی کا ارادہ کرے تو صرف ارادہ کرنے سے اس کے نامہ اعمال میں ایک نیکی لکھ دو اور جب وہ نیک عمل کرلے تو دس نیکیاں لکھو اور اگر بندہ کسی گناہ کا ارادہ کرے مگر پھر اللہ کے خوف سے چھوڑ دے تو گناہ کے بجائے اس کے نامہ اعمال میں ایک نیکی لکھ دو اور وہ گناہ کر ہی گذرے تو صرف ایک ہی گناہ لکھو۔

اس آیت میں لفظ ھَمّ زلیخا اور حضرت یوسف علیہ السلام دونوں کیلئے بولا گیا، مگر ان دونوں کے ھَمّ یعنی خیال میں بڑا فرق ہے۔

زلیخا کا ھَمّ عزم کی حیثیت سے ہے جو گناہ میں داخل ہے اور دوسرا حضرت یوسف علیہ السلام کا ھَمّ غیر اختیاری وسوسہ کی حیثیت رکھتا ہے جو گناہ میں داخل نہیں ہے، قرآن کریم کا اسلوب بیان بھی خود اس پر شاہد ہے کیوں کہ دونوں کا ھم وخیال اگر ایک ہی طرح کا ہوتا تو اس جگہ بصیغہ تثنیہ ولقد ھمّا کہہ دیا جاتا اس کو چھوڑ کر دونوں کے ھَمّ یعنی خیال کا بیان الگ الگ فرمایا لقد ھَمَّتْ بِہٖ وَھَمَّ بِھا۔ اور زلیخا کے ھَمّ کے ساتھ تاکید کے الفاظ لقد کا اضافہ کیا لام بھی تاکید کا اور قد بھی تاکید کی اور یوسف علیہ السلام کے ھَمّ کے ساتھ لام اور قد کی تاکید نہیں کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تعبیر خاص کے ذریعے

Marfat.com

یہی جتلانا ہے کہ زلیخا کا ھَمّ کسی اور طرح کا تھا اور یوسف علیہ السلام کا ھَمّ دوسری طرح کا تھا یعنی وسوسہ کے درجہ میں تھا۔ اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کی عفت و عصمت پر کوئی حرف نہیں آتا بلکہ ان کا اور زیادہ کمال واضح ہو جاتا ہے کیونکہ طبعی قوت بدنی صحت، جسمانی اعتدال، سلامتی اعضاء کی وجہ سے رغبت کے باوجود، نفس پر ضبط کرتے ہوئے گناہ کی طرف نہ بڑھنا اور وسوسہ کو مضبوط ارادہ کی شکل نہ دینا، بلکہ جان چھڑانے کی تدبیر نکالنا یہی دلیل ہے عفت و عصمت کی۔

توجیہ ۲: بعض کہتے ہیں ھَمَّتْ اور ھَمَّ میں یہ فرق ہے کہ زلیخا کا ھَمّ سوٗ کا تھا اور حضرت یوسف کا ھَمّ فرار کا تھا یعنی زلیخا برائی کا عزم کیئے بیٹھی تھی اور یوسف علیہ السلام نے بھاگنے کا عزم کر رکھا تھا ارادہ اس نے بھی کیا، ارادہ اُس نے بھی کیا، لیکن دونوں کے ارادوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسلیئے فرمایا: وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ اور ھَمَّا نہیں کہا جیسے فرمایا اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ مختصر جملہ انکم میتون کے بجائے لمبی عبارت لائی گئی۔ کیونکہ نفس موت میں اگرچہ سب شریک ہیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موت اور دوسروں کی موت کی نوعیت میں یقیناً زمین آسمان کا فرق ہے۔

توجیہ ۳: بعض علماء کہتے ہیں اس میں تقدیم و تاخیر ہے لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ شرط مؤخر ہے اور ھَمَّ بِھا جزاء مقدم ہے۔ قال ابو عبیدہ ھٰذا علی التقدیم والتاخیر کانہ اراد ولقد ھَمَّتْ بہٖ ولولا ان رَّا بُرْھان ربہٖ لَھَمَّ بِھا۔ یعنی زلیخا تو ارادہ کر چکی تھی اور یوسف علیہ السلام بھی اگر رب کا برھان رب نہ دیکھتے تو ارادہ کر لیتے۔

رہی بات کہ یوسف علیہ السلام کا والاتصرف عنی الخ کہنا یہ بھی عصمت نبوت کے خلاف نہیں در حقیقت انبیاء علیہم السلام کی نظر تمام امور میں مؤثر حقیقی اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہوا کرتی ہے، یہاں حضرت یوسف علیہ السلام اس گناہ سے دور رہتے ہیں اور معصوم ہونے میں اپنی ذات پر ناز نہیں کرتے بلکہ غایت درجہ کا تضرع اور عجز کرتے ہوئے اللہ عزوجل کے حضور عرض کرتے ہیں کہ آپ ہی مجھ سے اس فتنہ کو دور کر دیں۔

(استفادہ: معارف القرآن، وکمالین اردو ترجمہ شرح جلالین، جواہر القرآن، ابن کثیر)

Marfat.com

فائدہ ۱: برہان سے کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔
قول ۱: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ زلیخا نے کونے میں رکھے ہوئے ایک بت پر پردہ ڈالا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کا سبب پوچھا تو وہ بولی یہ میرا معبود ہے اس سے شرم آتی ہے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا تو اس بے حس و بے شعور معبود سے شرماتی ہے تو میں اپنے علیم و خبیر اللہ رب العزت سے کیوں نہ شرماؤں۔
قول ۲: بعض نے لکھا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام متمثل ہو کر سامنے آ گئے تھے لیکن یہ بات کمزور اور بے دلیل ہے۔
قول ۳: حضرت شیخ قدس سرہ فرماتے ہیں کہ برہان سے استقامت اور ربط القلب مراد ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو صلاح و تقویٰ پر اس قدر محکم و مستقیم فرمادیا کہ ان کے دل میں گناہ کا ارادہ بھی پیدا نہ ہوا۔ (جواہر القرآن)
قول ۴: ابن کثیر میں ہے کہ یوسف علیہ السلام نے جو برہان دیکھا تھا وہ تین آیات تھیں۔

۱۔ اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۔ الایہ (سورہ انفطار)
ترجمہ: اور تم پر نگہبان مقرر ہیں۔
۲۔ وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ۔ الایہ (سورہ یونس آیت ۶۱)
ترجمہ: اور آپ جس حال میں ہوں۔
۳۔ اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ۔ (سورہ رعد آیت ۳۳)
ترجمہ: بھلا جو لئے کھڑا ہے ہر کسی کے سر پر جو کچھ اس نے کیا ہے۔
(ترجمہ شیخ الہند)

حضرت ابو ہلال ایک آیت اور کہتے ہیں۔
وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى۔ زنا کی قریب مت جاؤ۔

قول ۵: حضرت اوزاعی فرماتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ نے دیوار پر یہ آیت دیکھی جس میں اس گناہ سے منع کی گئی تھی، اس پر یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ کوئی کہنے والا

Marfat.com

کھدے یہ آیات تو قرآن کریم کی ہیں اور قرآن کریم کا نزول تو آپ ﷺ پر ہوا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ آیات کیسے دیکھیں؟ تو اسکا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ ممکن ہو یہ آیات دوسری کتابوں میں بھی نازل ہوئی ہوں۔ فلا اشکال فیہ۔

قول ٦: اور ممکن ہے کہ بادشاہ کی شکل دکھائی گئی ہو، آگے لکھتے ہیں کہ وَلَا حُجَّة قاطعة علیٰ تعیین شیٔ من ذالك فالصواب ان یطلق کما قال اللہ تعالیٰ یعنی ان تمام مذکور باتوں میں سے کسی پر بھی کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے، کسی کو متعین نہ سمجھیں۔ بس اس کو مطلق رکھئے جیسے اللہ تعالیٰ نے مطلق رکھا ہے۔ (ابن کثیر ج ۲ ص ٦١٧، ٦١٨)

فائدہ ۲: کذالك لنصرف عنه السوٓء والفحشاء انه من عبادنا المُخْلَصِيْنَ (آیت ۲۴)

یعنی: ہم نے یوسف علیہ السلام کو یہ برہان اسلئے دکھائے کہ ان سے برائی اور بے حیائی کو ہٹادیں برائی سے مراد صغیرہ گناہ اور بے حیائی سے مراد کبیرہ گناہ ہیں۔ یہاں قابل نظر بات یہ ہے کہ برائی اور بے حیائی کو یوسف علیہ السلام سے ہٹادینے کا ذکر فرمایا ہے۔ یوسف علیہ السلام کو برائی اور بے حیائی سے ہٹانا نہیں فرمایا، جس میں اشارہ ہے کہ یوسف علیہ السلام تو اپنی شانِ نبوت کی وجہ سے اس گناہ سے خود ہی ہٹے ہوئے تھے مگر برائی اور بے حیائی نے ان کو گھیر لیا تھا ہم نے اس کے جال کو توڑ دیا، قرآن کریم کے یہ الفاظ بھی اس پر شاہد ہیں کہ یوسف علیہ السلام کسی ادنیٰ گناہ میں بھی مبتلا نہیں ہوئے اور نہ ان کے دل میں خیال پیدا ہوا تھا وہ گناہ میں داخل نہیں تھے ورنہ یہاں تعبیر اس طرح ہوتی کہ ہم نے یوسف علیہ السلام کو گناہ سے بچادیا، نہ یہ کہ گناہ کو ان سے ہٹادیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو مخلصین میں شمار کیا گیا ہے بفتح لام مخلص کی جمع ہے جس کی معنیٰ منتخب کے ہیں، مراد یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے ان بندوں میں سے ہیں جن کو خود اللہ تعالیٰ نے اپنے کارِ رسالت اور اصلاح خلق کیلئے انتخاب فرمایا ہے ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظتی پہرہ ہوتا ہے وہ کسی برائی میں مبتلا نہیں ہوسکتے۔ (معارف القرآن)

Marfat.com

نفس کا امارہ ہونا:

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ؕ (پارہ ۱۳ سورہ یوسف)

اور میں پاک نہیں کہتا اپنے جی کو بیشک جی تو سکھلاتا ہے برائی، مگر جو رحم کر دیا میرے رب نے بیشک میرا رب بخشنے والا ہے مہربان۔

چوتھی بحث: حضرت یوسف علیہ السلام کی عفت کے متعلق:

اس سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام خود اپنی عدم عفت کا اظہار کرتے ہیں جب کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں تو پھر اپنی عدم عفت و عدم عصمت کا اقرار کیا معنیٰ رکھتا ہے؟

وضاحت: توجیہ ۱: اس آیت سے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام ان لوگوں کو بتا چکے ہیں کہ

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِیْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۲﴾

ترجمہ: یہ اس واسطے کہ (عزیز کو) معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کے پیٹھ پیچھے اس کے معاملہ میں کوئی خیانت نہیں کی اور (حقیقت یہ ہے کہ) بیشک اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کی تدبیروں پر کبھی (کامیابی) کی راہ نہیں کھولتا۔

اس گفتگو سے حضرت یوسف علیہ السلام ان لوگوں کے سامنے اپنے آپ کی صفائی پیش کر رہے ہیں کہ میرا کوئی بھی قصور نہیں میں بلکل پاکباز اور صاحبِ عصمت ہوں ایک طرف تو ایسی پاکبازی کا ذکر وقت کی نہایت اہم ضرورت تھی انہیں ان جھوٹے الزام کا دفاع کرنا از حد ضروری تھا جس سے کئی برس وہ جیل میں رہے، لیکن اس کے ساتھ یہ گفتگو حضرت یوسف علیہ السلام کو اچھی بھی نہ لگتی تھی کیونکہ اس میں اپنے نفس کا تزکیہ اور پاکائی کا اظہار ہے اور اپنے آپ کو پاک صاف کہنا اچھا نہیں گرچہ آدمی پاک صاف بھی ہو کیونکہ اللہ رب العزت کا فرمان ہے فلا تزکوا انفسکم ھو اعلم بمن اتقی۔

یعنی تم اپنے نفس کی پاکی کے مدعی نہ بنو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں کہ کون

Marfat.com

واقعی پرہیزگار و متقی ہے۔

اسلئے فرمایا: وما ابرئ نفسی الآیة

یعنی اظہار فرمایا کہ میرا یہ کہنا اپنے تقویٰ اور پاکبازی کا جتلانا مقصود نہیں ہے۔

قال الحسن لما قال یوسف ذالك لیعلم انی لما آخنهٔ بالغیب کرِہ نَبِیُّ اللہ اَنْ یکون قد زکیٰ نفسهٗ فقال وَمَآ اُبَرِّئُ نفسی لِاَنَّ تَزْکِیَةَ النفس مذمومة

(قرطبی ج ۹ ص ۲۱۰ مطبع دار الکاتب مصر)

یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے جب لیعلم انی لم اخنه بالغیب کہا تو اس اللہ کے نبی نے اپنے نفس کی خود پاکیزگی بیان کرنا اچھا نہ سمجھا تو پھر فرمایا وما ابرئ نفسی ان النفس لامارۃ بالسوءِ الخ کہ نفس تو ہر انسان کا اس کو برے کاموں کی طرف مائل کرتا ہے بجز اسکے جس پر میرا رب اپنی رحمت فرما کر اس کے نفس کو برے کاموں سے پاک کر دے جیسے انبیاء علیہم السلام کے نفوس ہوتے ہیں، اور ایسے نفوس کو قرآن کریم میں نفس مطمئنہ کا لقب دیا گیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس ابتلاء عظیم کے وقت میرا گناہ سے بچ جانا میرا ذاتی کمال نہیں تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و دستگیری کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے نفس سے رذیل خواہشات کو نکال پھینکا۔
(استفادہ: معارف القرآن)

توجیہ ۲: بعض مفسرین کی رائے ہے کہ انی لم اخنه بالغیب اور وما ابرئ یہ زلیخا کا قول ہے اور ان النفس سے جنس نفس مراد ہے کوئی خاص نفس مراد نہیں۔ اور "لم اخنه" کی ضمیر کا مرجع عزیز مصر کو قرار دیا ہے۔

حافظ عماد الدین بن کثیر نے اپنی تفسیر ابن کثیر میں ایسا ہی بیان کیا ہے، جس کا مفہوم ہے "کہ میں (زلیخا) نے یہ اس لئے کہا کہ اس (عزیز) کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کے پیٹھ پیچھے (اس سے زیادہ اور کوئی) خیانت نہیں کی (جس کا حال اسے معلوم ہے) اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کے مکر کو کامیاب نہیں کرتا (سو اگر میں نے اس سے زیادہ خیانت کی ہوتی تو اس کا بھی پردہ فاش ہو کر رہتا) اور میں

Marfat.com

اپنے نفس کو بَرِی نہیں کرتی، بیشک نفس برائی کیلئے بڑا ہی ابھارنے والا ہے، مگر جس پر میرا پروردگار رحم کردے بیشک میرا پروردگار بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔"
(تفسیر ابن کثیر، قصص القرآن)

اس تفسیر کے اعتبار سے حضرت یوسف علیہ السلام پر کوئی شبہ نہیں۔ فلا اشکال فیہ۔

پانچویں بحث: حضرت یوسف علیہ السلام کا جیل یعنی قید خانہ کو بہتر سمجھنا:

رَبِّ السِّجۡنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدۡعُوۡنَنِیۡۤ اِلَیۡہِ ۚ

ترجمہ: اے میرے رب میرے لئے قید خانہ بہتر ہے اس کام سے جس کی طرف مجھے بلا رہی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ یوسف علیہ السلام نے جیل بڑی چاہت سے مانگا، حالانکہ وہ مجرم نہ تھے اور جیل تکلیف سے خالی نہیں اور تکلیف مانگنا کوئی نیکی ہے کیا؟

وضاحت: حقیقت یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے دو مصیبتیں تھیں، ایک زلیخا کا مقصد اور دوسرا زندان۔ یوسف علیہ السلام کی طرف سے قید کی طلب کرنا یہ ان کا شوق نہیں بلکہ اَھون البلیتین کو ترجیح دینا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کی بیوی سے چھٹکارا اسی میں دیکھا کیونکہ زلیخا نے دوسری صورت میں جیل کی دھمکی دی تھی اور اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کا عالی مقام اور انبیانہ صفت کا اظہار سمجھ میں آتا ہے کہ عین اس وقت جب زلیخا کی عزت داغدار ہو رہی تھی اس وقت خاموشی سے جیل میں چلے گئے تاکہ عزیز مصر اور زلیخا کی زیادہ فضیحت نہ ہو۔

علامہ سیوہاروی فرماتے ہیں کہ:

حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ جملہ "رب السجن احب مما یدعوننی الیہ" ان کے عُلوِّشان، تقرب الی اللہ، استقامت فی الدین، عزیمت فی الحق اور رضاء و تسلیم کا وہ بے نظیر مظاہر ہے جو ان جیسے اولوالعزم پیغمبروں کا ہی حصہ ہے۔ (قصص القرآن سورہ یوسف)

Marfat.com

چھٹی بحث: حضرت یوسف علیہ السلام کی جیل کے ساتھیوں سے گفتگو:

حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل کے ساتھیوں میں سے ایک سے کہا

اذکرنی عند ربک فَاَنسٰهُ الشَّیْطٰنُ ذِکْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِی السِّجْنِ بِضْعَ سِنِیْنَ۔

ترجمہ: میرا ذکر کرنا اپنے مالک (بادشاہ) کے پاس، سو بھلا دیا اسکو شیطان نے ذکر کرنا اپنے مالک (بادشاہ) سے، پھر رہا (یوسف علیہ السلام) قید میں کئی برس۔

بحث: حضرت یوسف علیہ السلام کا بادشاہ کے ساقی کو یہ کہنا کہ بادشاہ کے ہاں میرا تذکرہ کرنا کہ ایک بے قصور آدمی جیل میں پڑا ہوا ہے، یہ غیر اللہ سے مدد مانگنے کے مترادف ہے عام آدمی تو اس طرح کلام کر سکتا ہے لیکن منصبِ نبوت کے یہ مناسب نہیں۔ اس بات کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لو لم یقل یعنی یوسف الکلمة التی قال مالبث فی السجن طول مالبث حیث یبتغی الفرج من عند غیر اللہ۔

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت یوسف اگر یہ کلمہ نہ کہتے جس سے غیر اللہ سے مصیبت سے نکلنا طلب کر رہے تھے تو اتنا لمبا زمانہ جیل میں نہ رہتے۔

وضاحت: توجیہ ا: جہاں اس روایت کا تعلق ہے تو اس روایت کو علامہ عماد الدین بن کثیر رد کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ ھٰذا الحدیث ضعیف جداً لانّ سفیان بن وکیع ضَعِیْفٌ وابراھیم بن یزید ھو الخوزی اَضْعَفُ منه ایضاً وقد روی عن الحسن وقتادة مُرْسَلاً عن کل منهما وھٰذہِ المرسلات ھٰھنا لا تقبل لو قُبِلَ الْمُرْسَلُ مِنْ حَیْثُ ھُوَ فِی غَیْرِ ھٰذا الموطنِ واللہ اعلم (ابن کثیر ج ۲ ص ۱۲۴)

یعنی یہ حدیث بہت ہی ضعیف ہے کیونکہ اس روایت میں سفیان بن وکیع ہے وہ ضعیف ہیں اس سے بڑھ کر ابراہیم بن یزید خوزی ضعیف ہے اور یہ روایت مرسل ہے اور مرسل روایات اگر قابلِ قبول ہوتی بھی ہیں تو ایسے مقامات میں نہیں۔

یعنی ایسے حالات اور واقعات میں مرسل روایات قبول نہیں کی جاتی۔

Marfat.com

باقی حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ کہنا اسباب کے اعتبار سے ہے اور اسبابِ عادیہ کا اختیار کرنا چونکہ جائز ہے اسلئے اذکرنی عند ربک فرمانے پر کوئی اشکال نہیں ہونا چاہئے اور فلبث فِی السجن کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غیر اللہ سے حضرت یوسف کی درخواست کرنے کی سزا میں ان کو جیل خانہ میں رکھا گیا، اور اس آدمی کی بھول بھی طبعی طور پر ہے جیسے عام آدمی بسا اوقات بھول کا شکار ہوتا ہے۔ (استفادہ: کمالین)

عقل بھی یہی کہتی ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک اللہ کا نبی غیر اللہ کو مؤثر حقیقی سمجھ کر اس سے مدد مانگے، وہ تو کفار کے ماحول میں رہتے ہوئے بھی توحید کی تبلیغ کر رہے ہیں، دیکھو ان دونوں سے تعبیر بیان کرنے سے پہلے انہیں توحید کی تبلیغ کی۔

توجیہ ۲: اذکرنی عند ربک کا مطلب یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ بادشاہ کے سامنے میرا ذکر کرنا کہ ایک شخص ہم کو اس طرح دینِ حق کی تلقین کرتا ہے اور وہ اپنی ملت کو ہماری ملت سے جدا بتاتا ہے اور اس پر بہترین دلائل دیتا ہے۔

اس تفسیر کی صحت کیلئے مفسرین عظام قرینہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس موقع پر قرآن کریم میں یوسف علیہ السلام اور ان دو شخصوں کے درمیان صرف دو ہی باتوں کا تذکرہ پایا جاتا ہے ایک دعوت و تبلیغ اسلام کا اور دوسرے خواب اور اس کی تعبیر کا، تیسری کسی بات کا اشارہ تک نہیں، یعنی کسی اشارہ اور کنایہ سے بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان دونوں کے سامنے اپنا قصہ بیان کیا ہو اور ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہو، پھر بغیر ذکر سابق کے اس طرح اذکرنی عند ربک میں اجمال کے کیا معنی؟ علاوہ ازیں اگر حضرت یوسف کے زندان سے باہر آنے کی طلب و جستجو کا یہ حال تھا تو جب ساقی کو یاد آنے اور بادشاہ کے خواب کی تعبیر دینے کے بعد بادشاہ نے ان کی رہائی کا حکم دے دیا تو کیوں فوراً باہر نہ نکل آئے اور تفتیش حال کا مطالبہ کیوں کیا، یہ تفتیش تو رہائی کے بعد بھی ہو سکتی تھی، اور عصمت اور بے گناہی کا فیصلہ باہر آکر بھی کیا جا سکتا تھا۔

آیات کی ترتیب کے پیش نظر یہی تفسیر قابل ترجیح ہے۔ (قصص القرآن، قصہ یوسف ص ۲۴۳)

اس تفسیر کے اعتبار سے کوئی شبہ نہیں اور کوئی اشکال نہیں۔

Marfat.com

ساتویں بحث: حضرت یوسف علیہ السلام کا وزیر خزانہ ہونے کی طلب کرنا:

قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ۔

(حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ سے) کہا کہ مجھے مقرر کر ملک کے خزانوں پر میں نگہبان ہوں خوب جاننے والا ہوں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے سرکاری عہدہ کی طلب کی، جبکہ اس وقت کفار کی حکومت تھی اور قوانین کافرانہ نافذ تھے، نیز اپنی ذات کیلئے کوئی منصب یا عہدہ طلب کرنا جائز بھی نہیں۔

وضاحت: توجیہ ۱: ایسے حالات میں ایک خوفِ خدا آدمی کا ایسے عہدے پر فائز ہونا یہ خلق خدا پر رحم اور شفقت ہے جو وقت کی ضرورت تھی، یہاں تو ایک پیغمبر خدا ہے، قحط کے زمانہ میں انسانیت کے ساتھ رحم اور شفقت کے اعتبار سے اور عدل و انصاف کے اعتبار سے اس پیغمبر کے علاوہ اس وقت کوئی بھی لائق آدمی نہ تھا ایسے حالات میں جب اپنا کوئی نقصان نہ ہو اور دوسروں کا نفع ہو تو خلاف کمال نہیں ہے۔

توجیہ ۲: یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس عہدہ کی طلب وحی الٰہی سے کی ہو، تاکہ عدل کے ساتھ ملکی خزانہ تقسیم ہو جائے اس لئے کہ نبوت کہ وجہ سے انہیں عدل کرنے کا حکم تھا اور اس کی تعمیل اس عہدہ کے بغیر ناممکن تھی اور وہ اس کے حقدار بھی تھے لہٰذا مستحق کو اپنا حق وصول کرنا جائز ہے۔ (کمالین شرح اردو جلالین، عصمت انبیاء)

آٹھویں بحث: حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والد محترم کو حالات کی اطلاع کیوں نہیں دی؟

حضرت یوسف علیہ السلام کیلئے اس عظیم عہدہ پر فائز ہونے کے بعد ممکن تھا کہ اپنے غمگین باپ کو اپنی اطلاع دلوائے تاکہ ان کا غم کچھ ہلکا ہو، لیکن ایسا تو نہ کیا بلکہ بھائی آئے تو ان سے بنیامین کیلئے آنے کا مطالبہ رکھا پھر اس کو رکوایا یہ تمام باتیں حضرت

Marfat.com

یعقوب علیہ السلام کیلئے اذیت کا سبب تھیں، تو حضرت یوسف علیہ السلام اپنے باپ کو ایسی اذیتیں کیونکر دے رہے تھے۔

وضاحت: حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنی خیریت کی اطلاع تو اس وقت بھی ممکن تھی جب حضرت یوسف مصر پہنچے کیونکہ وہ عزیز مصر کے گھر میں آزادی اور آسائش کے ساتھ تھے اسی طرح جیل میں بھی رہتے ہوئے اطلاع کرواسکتے تھے، نیز بادشاہ بننے کے بعد تو یہ بھی ممکن تھا کہ خود چل کر والد محترم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور چالیس سال کی مفارقت کا غم دور کرتے، یہ خاموشی اور ایسی جفا تو کسی عام آدمی سے بھی تصور نہیں کی جاسکتی، یہاں تو اللہ کے برگزیدہ رسول ہیں جو کسی طرح بھی اطلاع نہیں دیتے حالانکہ انہیں والد محترم کے صدمے اور غم میں نڈھال ہونے کی خبر بھی پہنچتی ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے وحی کے ذریعے حضرت یوسف علیہ السلام کو روک دیا تھا کہ اپنے گھر اور اپنے متعلقین کو کوئی خبر نہ بھیجیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصلی حکمت اس امتحان کی تکمیل تھی جو حضرت یعقوب علیہ السلام سے لیا جارہا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس واقعے کی ابتداہی میں جب یعقوب علیہ السلام کو اندازہ ہوچکا تھا کہ یوسف علیہ السلام کو بھیڑیئے نے نہیں کھایا بلکہ بھائیوں کی کوئی شرارت ہے تو طبعی تقاضہ یہ تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام اسی وقت چل کر اسی جگہ پہنچتے اور بیٹوں سے کہتے مجھے وہ جگہ دکھاؤ اور تحقیق کرتے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کا دھیان اس طرف نہ جانے دیا اور پھر مدتوں کی بعد انہوں نے اپنے بیٹوں سے فرمایا کہ اذھبو فتحسسوا من یوسف واخیہ۔ الآیہ جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کی تلاش کرو۔ جب اللہ تعالیٰ کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو اس کے سب اسباب اسی طرح جمع فرمادیتے ہیں۔

(استفادہ: معارف القرآن)

نویں بحث: کیا حضرت یوسف علیہ السلام نے بنیامین کے سامان میں کٹورہ خود رکھا تھا؟

حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائی بنیامین کے سامان میں کٹورہ خود رکھا پھر انہیں چور

Marfat.com

کہا گیا، یہ تو ان پر تہمت ہے! حضرت یوسف علیہ السلام نے اس میں تمام بھائیوں کی رسوائی کیوں کی؟

وضاحت: توجیہ ا: جب حضرت یوسف علیہ السلام اور بن یامین کی آپس میں ملاقات ہوئی تو بن یامین نے حضرت یوسف علیہ السلام کو پہنچان لیا اور وہ مطمئن ہو گئے اور خود حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا کہ آپ مجھے ان بھائیوں کے ساتھ واپس نہ بھیجیں، مجھے اپنے پاس رکھیں۔ اب یوسف علیہ السلام فکر مند ہوئے کہ یہ کس طرح ہو سکتا، مصری قانون میں کسی غیر مصری کو بغیر کسی معقول وجہ کے روک لینا بھی سخت منع تھا اور اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کسی طرح نہیں چاہتے تھے کہ اس وقت لوگوں کے سامنے یا ان کے بھائیوں پر اصل حقیقت منکشف ہو، شاید اس وقت تک اس راز کی اہمیت اتنی زیادہ تھی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بن یامین کے روکنے میں بھی من جانب اللہ حکم ہو۔ حضرت یوسف علیہ السلام اس معاملہ میں بلکل خاموش رہے، لیکن بھائی کی نسبت اور محبت میں کسی کو بتائے بغیر نشانی کے طور پر اپنا شاہی قیمتی پیالہ ان کے سامان میں رکھ دیا۔ جب یوسف کے برادران رخصت ہو کر چلے گئے تو حضرت یوسف علیہ السلام کے کارندوں نے شاہی محل کے شاہی سامان اور شاہی برتنوں کی دیکھ بھال کی جیسے مہمانوں کے چلے جانے کے بعد سامان سمیٹا جاتا ہے وہ قیمتی پیالہ نہ پایا تو سمجھے کہ اس شاہی محل میں ان کنعانیوں کے سوا دوسرا کوئی آیا ہی نہیں لہٰذا یہ پیالہ انہوں نے اٹھایا ہے اور وہ فوراً ان کے پیچھے دوڑے تھوڑی ہی مسافت پر انہوں نے ان کو پالیا اور آواز دے کر کہا، "ایتھا العیر انکم لسارقون" قافلہ والو تم تو چور ہو پھر ان کا یہ مکالمہ ہوا جس میں برادرانِ یوسف نے اپنے قانون کے اعتبار سے چور کی سزا خود تجویز کی۔

چونکہ یہ شاہی مہمان تھے لہٰذا ان کو یوسف علیہ السلام کے سامنے لایا گیا یوسف علیہ السلام نے معاملے کی نوعیت دیکھی تو دل میں بے حد مسرور ہوئے اور خاموش رہے، سرکاری تفتیش کی شروعات دوسرے بھائیوں کے سامان سے کی۔ اس تفتیش کے عمل میں ہو سکتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا اشارہ ہو کہ تفتیش کی شروعات بن یامین کے

Marfat.com

سامان سے نی کی جائے لیکن یہ سارا معاملہ اتفاق سے ہوا۔ اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کا حیلہ سمجھ میں نہیں آتا اس کی دلیل یہ آیت ہے۔

کذالک کدنا لیوسف۔ الآیۃ

ترجمہ: یوں خفیہ تدبیر کر دی ہم نے یوسف کیلئے، وہ ہرگز نہ لے سکتا تھا اپنے بھائی (بنیامین) کو بادشاہ (مصر) کے طریقے کے مطابق مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی چاہے ہم درجے بلند کرتے ہیں جس کے چاہیں اور ہر جاننے والے سے اوپر جاننے والا ہے۔

رہی بات یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کو چور کہنے کی تو اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کا کیا قصور؟ یہ تدبیر تو من اللہ تھی اور چور تو کارندوں نے کہا جو حقیقت سے بے خبر تھے۔

توجیہ ۲: یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ اگرچہ یہ کلام ظاہری طور پر خبر ہے لیکن حقیقت میں یہ استفہام ہے گویا کہ یہ کہا گیا تم چور ہو؟ پھر ہمزہ استفہام کو گرا دیا گیا جس طرح ھٰذا ربی میں گرایا گیا ہے۔ (استفادہ: مظہری، کمالین، قصص القرآن)

دسویں بحث: یوسف علیہ السلام نے غلہ کی مالیت کیوں واپس کی تھی؟

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی جب پہلی بار غلہ کیلئے آئے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے غلہ کی مالیت ان کو واپس کیوں کی؟ کیا بیت المال، یعنی سرکاری خزانے میں یہ خیانت نہیں ہے؟

وضاحت: ان کی رقم ان کو واپس کرنے کی وجوہات ابن کثیر نے یہ بیان کی ہیں

خشی یوسف علیہ السلام ان لا یکون عندھم بضاعۃ اخریٰ یرجعون للمیرۃ بھا۔

تذممَ اَنْ یَّاخُذَ مِنْ اَبِیْہِ وَاِخْوَتِہٖ عِوَضًا عَنِ الطَّعَامِ اَرَادَ اَنْ یُّرِدَّھُم اِذَا وَجَدُوْھَا فِیْ مَتَاعِھِمْ تَحَرُّجًا وَّتَوَرُّعًا۔ (ابن کثیر ج ۲ ص ۲۲۸)

یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ خوف ہوا کہ ہو سکتا ہے ان کے پاس اس نقد اور مال کے علاوہ اور کچھ موجود ہی نہ ہو، ممکن ہے کہ دوبارہ غلہ لینے کیلئے نہ آ سکیں۔

Marfat.com

دوسری یہ کہ اپنے والد اور اپنے بھائیوں سے کھانے کی قیمت عوض لینا اچھا نہ سمجھا یہ گوارانہ ہوا۔

تیسری یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ ارادہ کیا جب وہ اس نقد کو اپنے سامان میں واپس دیکھیں گے تو پرہیز گاری کے طور پر اس کو حرج جانے گیں (چونکہ والد ماجد اللہ کے نبی ہیں وہ اس سامان کو مصری خزانے کی امانت سمجھ کر ضرور واپس کریں گے یا اس کی وضاحت طلب کرائینگے تو اس طرح بھائیوں کا دوبارہ آنا یقینی ہو جائے گا۔)

رہی بات خیانت کی تو اسکے لئے عرض ہے کہ ممکن ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اتنی رقم اپنی جیب سے سرکاری خزانے میں جمع کی ہو۔ نیز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سرکار کی طرف سے حضرت یوسف علیہ السلام کے وزیر خزانہ ہونے کے اعتبار سے کچھ کوٹہ مقرر ہو، کہ اتنی مقدار علیٰ وجہ البصیرۃ مفت دینے کا آپکو اختیار ہو اور اس اختیار کو حضرت یوسف علیہ السلام نے اس جگہ استعمال کیا ہو۔ واللہ اعلم

گیارھویں بحث: حضرت یوسف علیہ السلام کو سجدہ کیسے؟

وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا

اور وہ (حضرت یعقوب بمع خاندان) ان (حضرت یوسف) کے آگے سجدے میں گر پڑے۔

بھائیوں کے ساتھ والدین نے بھی سجدہ کیا تو حضرت یوسف علیہ السلام کیسے اس سجدے پر راضی ہوئے جبکہ یہ سجدہ غیر اللہ کو تھا، اگر مانا جائے کہ یہ سجدہ تعظیم کا تھا تو انہوں نے اپنے والدین کی اپنے لئے تعظیم اس انداز میں کیسے قبول کی؟ کیا اس میں والدین کی بے ادبی نہیں ہے۔

وضاحت: توجیہ ا: حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے یہ سجدہ عبادت کے اعتبار سے نہیں تھا بلکہ تعظیم کے اعتبار سے تھا، اور سجدہ تعظیم انبیاء سابقین کی شریعتوں میں جائز تھا، شریعت محمدیہ علیہ افضل الصلوات والتسلیم میں یہ تعظیمی سجدہ ذریعہ شرک ہونے

کی وجہ سے ممنوع کیا گیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب کی تعبیر کا سچا ہونا چونکہ امر الٰہی تھا اسلئے حضرت یوسف اس پر خاموش رہے۔

توجیہ ۲: حضرت عبد اللہ بن عباس نے فرمایا کہ یہ سجدہ شکر تھا اور اللہ تعالیٰ کیلئے کیا گیا تھا یوسف علیہ السلام کو نہیں تھا۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب یوسف علیہ السلام نے والدین کو اپنے تخت پر بٹھایا تو وہ اور ان کے بیٹے سارے اللہ کیلئے سجدے میں گر پڑے شکر کرتے ہوئے۔ (کمالین، معارف القرآن)

بارھویں بحث: تصدق علینا کا مطلب کیا ہے؟

یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے کہا:

وتصدق علینا اِنَّ اللہ یُجزی الْمُتَصَدِّقِیْنَ۔ (سورہ یوسف آیت)

اور صدقہ کر ہم پر اللہ تعالیٰ بدلہ دیتا ہے صدقہ کرنے والوں کو۔ شبہ ہوتا ہے کہ نبی زادہ ہونے کی وجہ سے صدقہ ان کیلئے کیسے حلال تھا یا سوال کرنا کس طرح جائز تھا؟

وضاحت: توجیہ ۱: تصدق کے لفظ سے حقیقی صدقہ مراد نہیں ہے۔ انہوں نے نہ وجوبی صدقے کی طلب کی تھی نہ خیرات کی بلکہ لین دین میں رعایت ان کی مطلوب تھی، اس کو صدقہ سے تعبیر کیا، ان کا مقصود تھا کہ ہم نے معمولی اور نکمی چیزیں لائی ہیں ان کو قبول فرمائیں۔

توجیہ ۲: بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ صدقہ کی حرمت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آل محمد سے مخصوص ہے، یعنی دوسرے انبیاء یا انکی اولاد کے لئے ممنوع نہیں تھا۔

(استفادہ: کمالین، معارف القرآن، بیان القرآن)

خلاصہ کلام:

اَلْفَضْلُ مَا شَھِدَتْ بِہِ الْاَعْدَاءُ

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعے میں متعلق تمام شخصیتوں کا حضرت یوسف علیہ السلام

Marfat.com

کی برأت کا اعتراف ہے۔

ا۔ عزیز مصر کی بیوی ۲۔ شہری عورتیں، ۳۔ عزیز کی بیوی کا رشتہ دار ۴۔ خود عزیز مصر۔ یہی افراد ہیں جو اس تحقیق طلب معاملے سے تعلق رکھتے ہیں، ان سب سے پہلے عزیز کی بیوی کا رشتہ دار سامنے آتا ہے اور پیراہن کے چاک ہونے کا عاقلانہ فیصلہ دے کر یوسف علیہ السلام کی پاکی کا اظہار کرتا ہے اور عورت کو مجرم ٹھراتا ہے۔

وَاِنْ كَانَ قَمِيصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ۔

اس وضاحت پر عزیز مصر بھی اقرار کرتا ہے کہ یوسف علیہ السلام بے گناہ اور معصوم ہیں اور یوسف اعرض عن ھذا کہہ کر حضرت یوسف سے معذرت کرتا ہے۔

اور جب یہ خبر پورے شہر میں آگ کی طرح مشہور ہوئی اور شہر کی عورتیں زلیخا کو ملامت کرنے لگیں تو زلیخا اقرار کرتی ہے۔

ولقد راوتہ عن نفسہٖ۔ انا راودتہ عن نفسہٖ میں نے پھسلانا چاہا تھا اور حضرت یوسف کی پاکبازی بیان کرتی ہے فاستعصم لیکن وہ صاف ہے، معصوم اور محفوظ ہے، آگے کہتی ہے ولئن لم یفعل نہیں مانے گا تو جیل میں بھجواؤں گی۔

اور جب بادشاہ نے بھرے دربار میں یوسف کے معاملے کی تفتیش کی تو شہری عورتیں بول اٹھیں حاش للہ ماعلمنا علیہ من سوءٍ۔ حاشا للہ ہم کو معلوم نہیں اس پر کوئی برائی، اس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی پر مہر لگا دی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک اور مقدس بندہ کی عصمت کے اعلان اور اس کے بارے میں شائبہ سوء ظن کے انہدام کیلئے علیٰ رؤس الاشہاد خود مجرم سے اقرار جرم کرایا اور اس ہی کی زبان سے یوسف کی عصمت و صداقت کی شہادت دلا کر حقیقتِ حال آشکارا کرا دی اور شاہی دربار میں عزیز کی بیوی کو یہ کہنا پڑا۔ الاٰن حصحص الحق انا راودتہٗ عن نفسہ وانہ لَمِنَ الصّٰدقین۔ اب کھل گئی سچی بات میں نے پھسلایا تھا اسکو اسکے جی سے اور وہ سچا ہے۔

Marfat.com

ابحاث حضرت ایوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق

بحث ۱: حضرت ایوب علیہ السلام کا قول ہے

مَسَّنِیَ الشَّیۡطٰنُ بِنُصۡبٍ وَّعَذَابٍ (سورۃ ص ۱۱ آیت ۴۱)

"کہ مجھے شیطان نے تکلیف اور عذاب پہنچایا۔"

عذاب عقاب کی طرح عمل کا ردعمل ہی ہوتا ہے اور یہی ان کے نافرمان ہونے کی دلیل ہے اور اس کی تائید اس روایت سے ہوسکتی ہے جسے بہت سے مفسرین نے نقل کیا ہے وہ یہ کہ ایوب علیہ السلام کو اسلئے اس امتحان میں مبتلا کیا گیا کہ وہ امر بالمعروف ونھی عن المنکر چھوڑ بیٹھے تھے۔

وضاحت: ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ہر عذاب انسان کو اس کے رد عمل ہی کے طور پر دیا جاتا ہے دیکھئے جو کھلم کھلا ظلم کرتا رہتا ہے اس کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ لوگوں کو عذاب دیتا ہے حالانکہ کہ یہ سارے لوگوں کی بد عملی کی سزا نہیں ہوتی۔ رہی شیطان کی طرف نسبت تو یہ مرض کی نسبت نہیں کی گئی بلکہ شیطان کی طرف نسبت اس وسوسے کی گئی ہے جس میں شیطان حضرت ایوب علیہ السلام کو سابقہ انعامات و خوشحالی اور صحت و تندرستی یاد دلاتا اور اللہ سے شکایت وناشکری کی دعوت دیتا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس آیت کی اخیر میں حضرت ایوب علیہ السلام کی مدح کرتے ہوئے فرمایا:

اِنَّا وَجَدۡنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعۡمَ الۡعَبۡدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ (سورۃ ص آیت ۴۴)

Marfat.com

"بیشک ہم نے ایوب کو بڑا صابر پایا وہ بڑے اچھے بندے اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔"

پس اس آیت کا اول اگر ان کے نافرمان ہونے پر دلالت کرے تو پھر اخیر میں گناہ پر ہی مدح و تعریف ہو گی اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام قابل مذمت بھی ہوں اور قابل مدح بھی ہوں۔ (عصمت الانبیاء)

بحث ۲: حضرت ایوب علیہ السلام کیلئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "ہم نے ان کو بڑا صابر پایا"

حالانکہ دیکھا جاتا ہے کہ حضرت ایوب تو مسنی الضر مجھے تکلیف پہنچ رہی ہے و مسنی الشیطان بنصب عذاب شیطان نے مجھے تکلیف اور عذاب پہنچایا ہے یہ الفاظ کہہ کر شکوہ کر رہا ہے۔

وضاحت: حضرت ایوب علیہ السلام کے یہ الفاظ شکوہ نہیں ہیں بلکہ یہ رب العالمین کے حضور میں دعا و التجا ہے جزع فزع اور بے صبری تب ہوتی جب مخلوق کے سامنے شکایت کرتے، خالق کائنات ارحم الراحمین کے حضور میں بندہ اپنا دکھڑا بیان کر کے اپنی بے بسی کا اظہار کرتا ہے تو یہ عین بندگی ہے یہاں تو حضرت ایوب علیہ السلام نے بڑی ہمت، ضبط اور عزم سے صبر و ثبات کا مظاہرہ کیا کہ زوجہ محترمہ نے عرض بھی کیا کہ آپ کی تکلیف بڑھ گئی ہے اللہ سے دعا کیجئے تو انہیں احساس دلایا کہ اللہ تعالیٰ نے اسی (۸۰) سال مجھے آسائش و نعمت میں رکھا ہے اس کے مقابل آٹھ سال بھی نہیں گذرے ہیں پھر ان کے سامنے کوئی ایسی ضرورت و گنجائش سامنے آئی تب اللہ کے حضور دست بدعا ہوئے ان کے صابر ہونے کیلئے یہی مضبوط دلیل ہے کہ مالک الملک ذوالجلال والاکرام خود فرماتے ہیں إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا نِّعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ۔

(استفادہ مظہری، معارف القرآن)

Marfat.com

بحث ۳: حضرت ایوب نے اس تکلیف کو شیطان کی طرف کیوں منسوب کیا؟

ہر نعمت و آسائش اور دکھ سکھ، بیماری اور شفا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے، یہاں حضرت ایوب علیہ السلام اس تکلیف کو شیطان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

وضاحت: وَاِنْ کَانَتِ الْاَشْیَآءُ کُلُّھَا مِنَ اللّٰہِ تَاَدُّباً مَّعَہٗ (جلالین سورہ ص)

گرچہ تمام کی تمام اشیاء اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا کرتی ہیں لیکن ادب کو ملحوظ کرتے ہوئے تکلیف کی نسبت یا کوتاہی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں کی جاتی، اللہ تعالیٰ نے سورہ جن میں جنوں کے حوالے سے بتایا کہ:

وَّ اَنَّا لَا نَدْرِیْۤ اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ۝

ہم نہیں جانتے کہ برا ارادہ ٹھہرا ہے زمین کے رہنے والوں پر یا ان کے رب نے ان کے حق میں راہ پر لانا چاہا ہے۔ (سورہ جن)

دیکھئے اس میں خیر کی نسبت اللہ عزوجل کی طرف کی گئی ہے اور شر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہ کی گئی بلکہ اسکو مبہم رکھا۔ دوسری بات کہ بعض مفسرین کے بقول شیطان حضرت ایوب علیہ السلام کے متعلقین کو وسوسہ ڈالتا تھا کہ اگر حضرت ایوب اللہ کا پیارا ہوتا تو اتنی بڑی تکلیف میں کیوں گذارتا؟ اللہ تعالیٰ اس پر رحم نہیں فرماتے؟ ایسی باتیں سن کر حضرت ایوب علیہ السلام کو دکھ ہوتا تھا اس اعتبار سے شیطان کی طرف نسبت کی۔ (استفادہ: تفسیر سہل البیان)

بحث ۴: کہتے ہیں کہ حضرت ایوب علیہ السلام کو جو تکلیف پہنچی تھی وہ اس کو کسی غلطی کے سبب تھی جیسے

قِیْلَ اِنَّہٗ اِسْتَغَاثَہٗ مَظْلُوْمٌ فَلَمْ یُغِثْہُ اَوْ اَکَلَ شَاۃً وَجَارُہٗ جَائِعٌ اِلٰی جَنْبِہٖ اَوْ اَعْجَبَ بِکَثْرَۃِ مَالِہٖ (حاشیہ ۸، جلالین ص ۳۸۳)۔

کہا گیا ہے کہ ان سے کسی مظلوم نے استغاثہ کیا تو انہوں نے اس کی مدد نہ کی یا بکری کا گوشت پکا کر خود تو کھایا لیکن ان کا پڑوسی ان کے پہلو میں بھوکا رہا یا وہ

Marfat.com

اپنی کثیر مال پر اترانے لگے۔

وضاحت: مذکورہ باتیں ایک پیغمبر کے شایانِ شان نہیں ایسا نہیں ہو سکتا کہ پیغمبر مظلوم کی مدد نہ کرے یا پڑوسی کو بھوکا برداشت کرے یا اپنے مالدار ہونے پر فخر کرنے لگے، یہ چیزیں منصبِ نبوت کے بالکل خلاف ہیں۔ درحقیقت ہمارے بعض مفسرین عظام نے اسرائیلی روایات سے دھوکا کھایا ہے، اسرائیلی روایات حضرت ایوب علیہ السلام کے مرض کے متعلق بہت مبالغہ آمیز ہیں ان روایات میں حضرت ایوب علیہ السلام کو ایسے امراض کی طرف انتساب کیا گیا جو باعثِ نفرت سمجھے جاتے ہیں، مثلاً جذام، پھوڑے، پھنسیوں یا کیڑوں کا لگ جانا یہاں تک کہ بدن گل سڑ گیا بدبو اٹھنے لگی لوگ نفرت کرنے لگے، شہر سے دور ویرانہ میں پھینک دیا گیا، غور کرنے کا مقام ہے ایسا مرض نبی کو کیسے لاحق ہو سکتا ہے جس سے وقت کا نبی لوگوں کی نگاہوں میں باعثِ نفرت ہو اور لوگ اس کی وجہ سے دور بھاگتے ہوں، پھر یہ پیغمبر کیسے ابلاغ و ارشاد کر سکتا ہے کیسے اپنے نبوت کے فرائض سرانجام دے سکتا ہے، کیا یہ رشد و ہدایت کے منافی نہیں ہے! لہٰذا ماننا پڑے گا یہ اسرائیلی روایات کا ڈھونگا ہے جو کہ غیر مستند اور متضاد بھی ہیں۔ دیکھئے بیوی کو سو تازیانے مارنے کے متعلق کہیں کہتے ہیں کہ شیطان نے حضرت ایوب علیہ السلام کی بیوی سے کہا کہ میں علاج کرونگا شفایاب ہونے کے بعد فقط اتنا کہدے "شفا الطبیب" کہ طبیب نے شفا دی اور کہیں یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ابلیس نے حضرت ایوب علیہ السلام کی بیوی کو بکری کا بچہ لاکر دیا اور کہا کہ ایوب کو چاہئے کہ اس کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کردے اس طرح وہ تندرست ہو جائے گا مطلب کہ اس طرح متضاد و غیر مستند باتیں ہیں جو حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعے پر منطبق کی جاتی ہیں۔ درحقیقت قرآن کریم نے حضرت ایوب علیہ السلام کے مصائب کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی اور نہ ہی کوئی مستند حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی باتوں پر دلالت کرتی ہے۔

بس یہ اللہ عزوجل کی حکمت ہے کہ بعض انبیاء علیہم السلام کو مال کی کثرت و ثروت یا بادشاہت کا منصب دے کر آزمائش کی اور بعض کو مسکینی، غربت اور بعض کو جسمانی

Marfat.com

مشقت دے کر آزمائش میں رکھا۔

باقی ان آیات کی صحیح توجیہ کیا ہے؟ تو اسکے لئے عرض ہے کہ "انی مسنی الضر اور مسنی الشیطان" کی صحیح توجیہ ہم نے بحث نمبر ۲ کے جواب میں عرض کی ہے، باقی "وھبنالہ اھلہٗ ومثلھم معھم" کی توجیہ میں بتایا جاتا ہے کہ اس میں قرآن کریم میں اجمال ہے اس کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اس امتحان و آزمائش میں حضرت ایوب علیہ السلام کے اہل خانہ پر کچھ ایسے اسباب وحالات آئے ہوں جن کی وجہ سے انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ رہنے کی ضرورت در پیش آئی ہو یا کہیں دور جانے کی نوبت آئی ہو اور اب اللہ تعالیٰ نے فضل کر کے ان کے حالات کو بہتر بنایا اور معاملات کو مجتمع کیا ہو اور اس کے ساتھ مزید اور اولاد عنایت کی ہو اور یہ بھی ممکن ہے مرے ہوئے بچے زندہ کیئے گئے ہوں۔ "فاضرب بہ ولا تحنث" اس بات کو بھی قرآن کریم نے اجمال میں رکھا ہے، میاں بیوی کا معاملہ ہے گھر کے کام میں کبھی کبھی ایک دوسرے کے کام کو ناپسند کرنا ہوتا ہے کبھی تو ایک دوسرے کی آپس میں تُو تُو بھی ہو جاتی ہے یہاں بھی ممکن ہے حضرت ایوب علیہ السلام اپنی بیوی سے کسی کام سے خفا ہوئے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے بیوی نے حضرت ایوب علیہ السلام کے مرض کی دراز مدت کے صدمہ سے کچھ ایسی بات کا اظہار کیا ہو جو فی نفسہٖ تو ناجائز نہ ہو لیکن نبی کے شایانِ شان نہ ہو اس پر حضرت ایوب علیہ السلام نے غصہ کیا ہو لیکن اللہ تعالیٰ رحمت بی بی (حضرت ایوب علیہ السلام کی بیوی) کی خدمت پر خوش ہو کر ان پر رحمت کرتے ہیں کہ ان کو بھی تکلیف نہ پہنچے اور حضرت ایوب علیہ السلام بھی اپنے قسم میں حانث نہ ہوں خود ترکیب بتائی۔

(استفادہ: سہل البیان)

Marfat.com

ابحاث حضرت شعیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق

بحث اول، کیا حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی لڑکی کا نکاح غیر کفو میں کیا؟

قَالَ اِنِّیْٓ اُرِیْدُ اَنْ اُنْکِحَکَ اِحْدَی ابْنَتَیَّ ـــ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ

ترجمہ: (حضرت شعیب علیہ السلام) کہنے لگے کہ میں چاہتا ہوں کہ ان دو لڑکیوں میں سے ایک کو تمہارے ساتھ بیاہ دوں اس شرط پر کہ تم آٹھ سال میری نوکری کرو، پھر اگر تم دس سال پورے کرو تو یہ تمہاری طرف سے (مہربانی) ہوگی۔

بحث ۱: حضرت شعیب علیہ السلام نے کفو کا خیال نہیں کیا بغیر تحقیق کے اپنی لڑکی ایک اجنبی کو دے دی۔

وضاحت: توجیہ ۱: حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی نے راستہ میں موسیٰ علیہ السلام کی جو شرافت اور دیانت دیکھی وہ اپنے باپ سے بیان کی، نیز حضرت شعیب علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے حالات کی تفصیل پوچھی تو انہیں معلوم ہوگیا کہ یہ آدمی صالح ہے، اور یہی نیکی و شرافت ان کیلئے کفو ہونا کافی تھی۔

توجیہ ۲: ہوسکتا ہے حضرت شعیب علیہ السلام نے اس رشتہ کے سلسلے میں اپنی بیٹی کی راء طلب کی ہو، مشورہ کیا ہو تو اس صورت میں غیر کفو میں دونوں کی رضا سے رشتہ طے کرنے میں کوئی اشکال نہیں۔

Marfat.com

توجیہ ۳: قرآن کریم تو قصہ کے ضروری اور مقصود اجزاء فقط ذکر کرتا ہے، باقی قصہ کے جو حصے لازم ہوتے ہیں وہ آدمی خود سمجھ جاتا ہے، جب ہمارے جیسے عام لوگ بغیر تحقیق کے اپنی لڑکی کسی کو دینے کو تیار نہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے تحقیق نہ کی ہوگی۔ حضرت شعیب علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے مدین کی اولاد میں سے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے ہونا ان کے سامنے واضح ہوا ہوگا تو پھر غیر کفو کا اعتراض باقی نہیں۔

دوسری بحث: کیا حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی لڑکی کا نکاح بغیر گواہوں کے کیا؟

احدی ابنتی ھاتین سے معلوم ہوتا ہے کہ منکوحہ متعین نہیں تھی، نیز دوسری آیت میں ہے "واللّٰہُ علیٰ مَانَقُوْلُ وَکِیْلٌ" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نکاح میں کوئی گواہ بھی نہ تھا۔

وضاحت: یہ گفتگو باقاعدہ عقد نکاح کی مجلس کی گفتگو نہ تھی بلکہ مجلس عقد نکاح سے پہلے ایک دوسرے کو اعتماد میں لینے کیلئے دونوں بزرگوں نے یہ بات کی۔ یقیناً نکاح کے وقت انہوں نے اپنی شریعت کے تقاضوں کو پورا کیا ہوگیا۔

وھٰذہ مواعدۃ منہ ولم یکن ذالک عقد نکاح اذلو کان عقدَ اَلقَال قَدْ اَنکَحْتُکَ۔

یعنی یہ ایک دوسرے سے آپس کے انجام تھے اور عقد نکاح کی مجلس نہ تھی اگر عقد نکاح کی مجلس ہوتی تو ضروریوں بولتے قد انکحتُکَ کہ میں نے تجھے اپنی لڑکی کی نکاح میں دے دی۔ اور اُرِیْدُ اَنْ اُنْکِحَکَ کا لفظ نہ بولتے یعنی میں آپکو نکاح میں دینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ (مدارک التنزیل علیٰ ہوامش الخازن ج ۳ ص ۴۳۰ مطبع حافظ کوئٹہ)

تیسری بحث: کیا شوہر کی خدمت بیوی کا مہر ہو سکتی ہے؟

"عَلٰۤی اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس ملازمت و خدمت کو نکاح

Marfat.com

کا مہر قرار دیا گیا، تو یہ کیسے درست ہے کہ شوہر بیوی کی خدمت کرے، بیوی کی خدمت کو مہر بنانا تو شوہر کی تکریم واحترام کے خلاف ہے۔

وضاحت: توجیہ ۱: ہو سکتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی شریعت میں ایسی گنجائش ہو، ہم اپنی شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فروعی احکام حضرت شعیب علیہ السلام پر لازم نہیں کر سکتے۔

توجیہ ۲: یہ ایسی خدمت تھی جس کا تعلق بیوی کی ذات سے نہ تھا، بلکہ اس کا تعلق اس کے گھر سے باہر تھا۔

توجیہ ۳: یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انکی شریعت میں مہر کو معین کئے بغیر نکاح درست ہو جاتا ہو۔ باقی آٹھ سال کی پابندی حضرت شعیب علیہ السلام نے ایک دوسری ضرورت کے پیشِ نظر کی ہو یا اس اعتبار سے کہ میری بیٹی نکاح کے بعد میرے گھر سے جلد چلی نہیں جائے۔ اس محبت سے آٹھ سال کی قید لگا دی۔

چوتھی بحث: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اُجرت پر لینا

"ان تأجرنی" سے یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی ذات کیلئے مخصوص کیا تھا تو پھر شبہ یہ ہوتا ہے کہ اگر یہ خدمت وملازمت بیٹی کا مہر تھا تو پھر حضرت شعیب علیہ السلام نے بیٹی کو مہر سے کیوں محروم کر دیا، اپنی بیٹی کا حق خود کیوں کھایا۔

وضاحت: توجیہ ۱: ہو سکتا ہے کہ بیٹی نے رضا خوشی سے یہ حق باپ کے حوالے کیا ہو۔

توجیہ ۲: ہو سکتا ہے کہ یہ بکریاں بیٹی کی ملکیت ہوں اور حضرت شعیب علیہ السلام نے ولی و نگران بن کر اس حق مہر لینے کی نسبت اپنی طرف کی ہو۔

توجیہ ۳: اگر اس اندیشہ کو سامنے رکھا جائے کہ ہو سکتا ہے کہ انکی شریعت میں مہر کے بغیر بھی نکاح درست تھا جیسے پیچھے ذکر کر کے آئے ہیں تو پھر کوئی اشکال ہی نہیں کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے بیٹی کا حق کھایا۔

(استفادہ: بیان القرآن، معارف القرآن، عصمت الانبیاء)

Marfat.com

پانچویں بحث: کیا حضرت شعیب علیہ السلام نبوت سے پہلے کفر پر تھے؟

لنخرجنك یٰشعیب والذین اٰمنوا معك ان عدنا فی ملتكم بعد اذ نجّٰنا الله منها

ترجمہ: (قوم کے متکبر سرداروں نے کہا) ہم ضرور نکال دیں گے تجھ کو اے شعیب اور ان کو جو کہ ایمان لائے تیرے ساتھ اپنے شہر سے، یا یہ کہ تم لوٹ آؤ ہمارے دین میں، (حضرت شعیب نے) فرمایا کیا ہم بیزار ہوں تو بھی۔ بیشک ہم نے بہتان باندھا اللہ تعالیٰ پر جھوٹا اگر لوٹ آئیں تمہارے دین میں بعد اس کے کہ نجات دے چکا ہم کو اللہ تعالیٰ اس سے۔

بحث: "عود" کہتے ہیں پہلے حالت کی طرف لوٹنے کو یہاں کفار نے حضرت شعیب علیہ السلام کو دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ آپ اپنی جماعت سمیت ہماری ملت کی طرف لوٹ آیئے۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ کیا شعیب علیہ السلام پہلے ان کفار کے طریقہ کفر پر تھے؟ اگر کہا جائے کہ یہ کافروں کا زعم تھا کہ دعوت نبوت سے پہلے وہ ان کو اپنی ملت میں سمجھتے تھے، تو بڑا اشکال ہوتا ہے حضرت شعیب علیہ السلام کے جواب میں "اِنْ عُدْنَا فی ملتکم" تو یہ لفظ عدنا تقاضہ کرتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے ان سرداروں کے اس الزام کو تسلیم کر لیا، تو کیسے ہو سکتا ہے کہ نبی نبوت سے پہلے ملت کفریہ پر ہو؟

وضاحت: توجیہ ۱: یہ بناء بر تغلیب کے ہے، یعنی اگرچہ حضرت شعیب علیہ السلام پہلے ان کے طریقہ کفر پر نہیں تھے مگر آپ کے ساتھی جو ایمان لا چکے تھے یہ پہلے کافر ہی تھے، ان ہی کے ساتھ حضرت شعیب کو بھی تغلیباً شمار کر لیا گیا اور خود حضرت شعیب علیہ السلام نے بھی اپنا جواب اسی تقدیر پر دیا۔

توجیہ ۲: عود صار کے معنی میں بھی آتا ہے تو پھر اشکال ہی پیدا نہ ہو گا تقدیر عبارت یوں ہو گی، اِنْ عُدْنَا۔ ای صِرْنَا فی ملتکم۔

نیز یہ بات بھی مسلم ہے کہ عود کا لفظ قرآن و حدیث میں ایسے مواقع میں بھی مستعمل ہوا ہے جہاں پہلے کسی چیز کا وجود نہ ہو اور پہلی دفعہ وجود میں آجائے، جیسا کہ

Marfat.com

قیامت و آخرت کو قرآن کریم میں معاد کہا گیا ہے جبکہ قیامت ایک ہی دفعہ ہو گی۔ اس سے قبل کبھی نہیں آئی۔

اسی طرح لفظ نجات بھی ایسی چیزوں کیلئے استعمال کیا گیا ہے جس میں انسان پہلے سے گرفتار نہ ہو جیسا کہ ایک صحیح و سالم اور تندرست آدمی کسی کو مصیبت میں گرفتار دیکھے اور یہ دعا کرے۔

الحمد للہ الذی نجانا مما ابتلی به فلاناً

اللہ تعالیٰ کا شکر و حمد ہے جس نے ہمیں اس مصیبت سے محفوظ رکھا، جس مین فلاں بندہ مبتلا ہے۔

توجیہ ۳: "نجانا اللہ منہا" میں ضمیر ملت کی طرف راجع ہے اور ممکن ہے کہ نزولِ وحی سے قبل شعیب علیہ السلام اس دین کے مکلف ہوں، پھر بعد میں وہ دین منسوخ کیا گیا اور قوم کے سرداروں نے دوبارہ اس منسوخ شدہ دین کی طرف دعوت دی ہو اور شعیب علیہ السلام نے یہ جواب دیا ہو کہ ہم ہرگز اس منسوخ دین کی طرف جواب مُحرّف بھی ہو چکا ہے لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ (تفسیر کمالین، عصمت الانبیاء)

Marfat.com

ابحاث حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق

بحث اول: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قبطی کو قتل کرنا۔

ارشاد ربی ہے

فَوَكَزَهُ مُوسَىٰ فَقَضَىٰ عَلَيْهِ۔ (سورۃ قصص آیت ۱۵)

ترجمہ: پھر موسیٰ نے اسکو مُکا مارا پس اسکو تمام کر دیا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ قبطی کا قتل مستحسن تھا یا نہیں اگر وہ واجب القتل تھا تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کو شیطانی عمل کیوں قرار دے رہے ہیں کہ فرمایا ھٰذا من عمل الشیطان یعنی شیطان کا عمل ہے اور فرمایا رب انی ظلمت نفسی یعنی اے میرے رب میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور فرمایا۔

فعلتھا اذًا وّانا مِنَ الضَّالِیْنَ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اس کو واجب القتل نہیں سمجھتے تھے، نیز اپنے آپ کو ظالم کہہ کر اپنے عصیان کا اعتراف کرتے ہیں۔

وضاحت: توجیہ ا: بعض حضرات کا کہنا ہے کہ وہ قبطی کافر شرعی اصطلاح کے لحاظ سے ایک حربی کافر تھا جس کا قتل عمداً بھی مباح اور جائز تھا، کیونکہ یہ کسی اسلامی حکومت کا ذمی نہ تھا اور نہ ہی موسیٰ علیہ السلام سے اس کا کوئی معاہدہ تھا۔ نیز حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو عین ظلم کرتے وقت مارا ہے لیکن بعض حضرات اس کا قتل مباح نہیں مانتے، ان کا کہنا ہے کہ گرچہ معاہدہ قولی یا تحریری نہ تھا، تاہم مسلم اور غیر مسلم

Marfat.com

آدمیوں کا کسی حکومت میں باہمی امن واطمینان کے ساتھ رہنا یہ عملاً صلح کا معاہدہ شمار کیا جاتا ہے ایسی صورت میں ایک دوسرے کا حملہ اور لوٹ مار کرنا غداری شمار کی جاتی ہے۔ اس صورت میں قبطی کو عمداً قتل کرنا درست نہ ہوگا۔

لیکن یہ بات مسلم ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو اس کو مُکا کارا تو اس سے موسیٰ علیہ السلام کا مقصود اس کو قتل کرنا بالکل نہیں تھا کیونکہ گھونسہ رسید کرنے سے آدمی عادتاً نہیں مرتا۔ موسیٰ علیہ السلام کا مقصود تو مظلوم سے ظالم کو دفع کرنا تھا، لیکن غیر متوقع طور پر اس قبطی کی موت واقع ہوگئی۔ حقیقت یہ ہے اگر ظالم کو سمجھایا جائے اور اسے ظلم سے باز آنے کو کہا جائے پھر بھی وہ ظلم سے باز نہ آئے تو ایسے ظالم کو ارادۃً بھی قتل کرنا درست ہے۔

جواہر القرآن کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس قبطی کو زبانی سمجھایا کہ وہ اسرائیلی پر ظلم نہ کرے لیکن وہ الٹا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گستاخی کرنے لگا لہٰذا ایسے ظالم کو قتل کرنا درست تو تھا لیکن ابھی موسیٰ علیہ السلام کو ظالموں سے لڑنے اور ان کو قتل کرنے کا حکم نہیں ہوا تھا لہٰذا موسیٰ علیہ السلام اس کے قتل کا ارادہ نہیں رکھتے تھے تاہم بغیر ارادہ اسکا قتل موسیٰ علیہ السلام پر گراں گذرا کیونکہ یہ امر غیر اولیٰ تھا اور ایک ایسی شخصیت جو عنقریب تاج نبوت سے سرفراز ہونی تھی تو ان کو اس غیر اولیٰ عمل پر بے چین ہونا ان کا طبعی امر تھا۔ انبیاء علیہم اسلام کی فطرت پاک و صاف ہوتی ہے وہ اظہار نبوت سے پہلے بھی ذرہ ذرہ کاموں کا محاسبہ کرتے رہتے ہیں لہٰذا وہ اپنی خفیف سی بے احتیاطی کو بھی پہاڑ سمجھتے تھے۔

توجیہ ۲: رہی یہ بات کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس کو عمل شیطانی قرار دیا تو اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ قبطی کے مرنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ فکر لاحق ہوئی ہوگی کہ اس کو مُکا مارنے میں مجھے احتیاط سے کام لینا چاہئے تھا اس بے احتیاطی کو شیطانی عمل قرار دے رہے ہیں اور ہر قابل کراہت عمل کو شیطان کی طرف منسوب کرنا درست ہے۔ کیونکہ شیطان انسان کا ازلی ابدی دشمن ہے اور وہ انسان کیلئے ایسے مواقع

Marfat.com

اور افعال ساز گار بنا تا رہتا ہے، اگر نہ بھی بنائے تو خوش ضرور ہوتا ہے لہٰذا ناپسند امور کی نسبت شیطان کی طرف کرنا درست ہے اور یہاں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو اس عمل کی نسبت شیطان کی طرف کی ہے تو اسی اعتبار سے ہے۔

(استفادہ: سہل البیان، جواہر القرآن، کمالین، معارف القرآن)

''ھٰذا من عمل الشیطان'' کی دوسری توجیہ یہ بھی ہے کہ اس مقتول قبطی کا عمل شیطانی ہے کیونکہ وہ ظلم کر رہا تھا وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کر رہا تھا۔ اسلئے وہ قتل کا مستحق تھا اس صورت میں ھٰذا کا اشارہ مقتول کی طرف ہے اور مطلب یہ ہوگا کہ مقتول، شیطان کا لشکری اور اس کا ہم جماعت تھا جیسا کہ عرب کہتے ہیں ھٰذا من عمل الشیطان یہ یعنی شیطان کے ساتھیوں میں سے ہے۔

اس توجیہ سے اشکال باقی نہیں رہتا۔

توجیہ ۳: رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ۔ اسکا مطلب یہ ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس وقت بھی کوئی عامی آدمی نہ تھے بلکہ کاملین کے درجے کے تھے اور ان سے جب یہ غیر اولیٰ عمل صادر ہوا تو وہ اس عمل کو بھی اپنے اوپر ایک بارِ گراں سمجھ رہے تھے اسلئے اس کو ظلم سمجھا اور یہ حقیقت ہے کہ ایک صاف پوش آدمی ہمیشہ پاکی اور صفائی کے ساتھ رہنے والا آدمی ذرا سا مٹی کا دھبہ بھی اپنے کپڑوں پر برداشت نہیں کرتا، گرچہ اس سے کپڑے پلید بھی نہ ہوں اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ کاملین کو دوسروں کی بنسبت خشیت زیادہ ہوتی ہے وہ مقربین ہونے کی وجہ سے حقیر سی فرو گذاشت کو بھی عظیم گناہ جانتے ہیں۔

توجیہ ۴: قال فعلتھا اذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّالِّیْنَ۔ فرمایا کہ جس وقت میں نے یہ (کام قبطی کو قتل) کیا تو اس وقت میں بے خبر (لوگوں میں سے) تھا۔ قطبِ زمان ولی کامل حضرت تاج محمود امروٹیؒ نے معنیٰ کیا ہے ''میں بے سمجھ تھا'' اس آیت میں ضالّین کا لفظ آیا ہے اس سے اشتباہ پیدا ہوتا ہے لہٰذا لفظ ''ضَال'' کی لغوی تحقیق ضروری ہے۔ علامہ راغب اصفہانی یوں رقمطراز ہیں۔

Marfat.com

والضلال من وجه اٰخر ضربان۔ ضلالٌ فی العلوم النَّظَرِیَّۃ، کالضَّلَالِ فِی مَعْرِفَۃِ اللّٰہِ وَ وَحْدَانِیَّتِہٖ وَمَعْرِفَۃِ النُّبُوَّۃِ وَنَحْوِھِمَا المُشَارُ الیہما بقولہ (ومن یکفر باللہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہٖ والیوم الاٰخر فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلاً بَعِیْداً) وَضَلالٌ فی العلوم العَمَلِیَّۃِ کَمَعْرِفَۃِ الاَحْکَامِ الشَّرعِیَّۃِ الَّتِی ھی العبادات (المفردات فی غریب القرآن)

یعنی ضلال کے دو قسم ہیں ایک نظریہ اور عقیدہ میں جیسے اللہ تعالیٰ کی توحید اور نبوت کی معرفت میں ضلالت اختیار کرنا (ان جان ہونا) جیسے اس آیت میں اشارہ ہے۔ ''اور جو کفر کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے فرشتوں اور اس کے کتابوں اور اس کے رسولوں اور آخرت کے دن سے تو بیشک وہ دور کی گمراہی میں گمراہ ہوا۔'' ضلال کی دوسری معنی ہیں عملی علوم میں ان جان ہونا، شریعت کے احکام وعبادات سے بے خبر ہونا۔

لفظ ضلالت مختلف معانی میں مستعمل ہے دیکھئے عورتوں کے متعلق فرمایا (اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰھُمَا فَتُذَکِّرَ اِحْدٰھُمَا الْاُخْرٰی) یعنی دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر اس لئے رکھی گئی ہے کہ اگر ان دونوں میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اس کو یاد دلائے۔ تو یہاں ضلال کے معنی نسیان یعنی بھولنا ہوا، اسی طرح زلیخا کے متعلق یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

وَقَالَ نِسْوَۃٌ فِی الْمَدِیْنَۃِ امْرَاَتُ الْعَزِیْزِ تُرَاوِدُ فَتٰھَا عَنْ نَّفْسِہٖ قَدْ شَغَفَھَا حُبًّا اِنَّا لَنَرٰھَا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔ (سورہ یوسف آیت ۳۰)

ترجمہ: بیشک فریفتہ ہو گیا اس کا دل اُسکی محبت میں ہم تو دیکھتے ہیں اسکو صریح خطا پر (ترجم شیخ الہند)

ظاہر ہے مصر کی عورتوں نے جو زلیخا کے متعلق یہ لفظ استعمال کیا تو اس سے ان کا مقصد نظریاتی اور عقیدہ کے لحاظ سے گمراہ بیان کرنا قطعاً نہیں تھا بلکہ یوسف علیہ السلام کی محبت میں حد سے زیادہ مست اور محبت میں گم ہونا تھا اور یہاں قرآن کریم کے سیاق و سباق سے بھی یہی مطلب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ جب فرعون نے کہا:

''فعلت وَاَنْتَ مِنَ الْکَافِرِیْنَ۔''

Marfat.com

تو اس کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ فرمایا جس کا مطلب ہے کہ برابر وہ قبطی میرے ہاتھ سے مرا ہے لیکن میرا مقصد اس کو قتل کرنا نہیں بلکہ اس کو اتنی سزا دینا تھا جس کا وہ مستحق تھا میں نے تنبیہ کرنے کیلئے فقط ایک ہی گھونسہ مارا جس سے وہ ہلاک ہو گیا۔ مجھے یہ خبر نہ تھی کہ میرے ایک ہی مکے سے مر جائے گا کیونکہ یہ بات مسلم ہے کہ ایک مکے سے آدمی مرتا نہیں ہے تو میرا یہ قتل بلا ارادہ ہوا اور بے خبری سے ہوا، تو اس میں کافر یا ناشکر نہیں ہوں۔ (استفادہ: تفسیر سہل البیان، معارف القرآن)

توجیہ ۵: کہ جب فرعون نے یہ دعویٰ کیا کہ تم تو قبطی کے قتل تک کافر تھے تو موسیٰ علیہ السلام نے اس کی دعویٰ کو رد کرتے ہوئے فرمایا کہ اس وقت میں کافر نہ بلکہ متحیر تھا یعنی مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ اس وقت مجھے پر کیا کرنا واجب ہے اور میرا مولا مجھ سے کیا ارادہ رکھتا ہے۔ (عصمت الانبیاء)

لفظ ضلال کے معنی مختلف ہیں بے کبر، متحیر، گم ہونا، بھول جانا، وغیرہ جیسے پیچھے حضرت یوسف علیہ السلام کے ابحاث میں ہم بیان کر چکے ہیں۔

دوسری بحث: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اسرائیلی کو انك لَغَوِیٌّ مُبِیْنٌ کہنا

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسرائیلی کو "انك لَغَوِیٌّ مُبِیْنٌ" کا لقب کیوں دیا جبکہ حضرت موسیٰ اسرائیلی کو مظلوم بھی جانتے تھے۔

وضاحت: بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعونی سے کہا تھا "انك لَغَوِیٌّ مُبِیْنٌ" کیونکہ وہ ظلم کر رہا تھا۔ پھر اسرائیلی پر آپکو رحم آیا اور فرعونی کو پکڑنے کیلئے ہاتھ بڑھایا (تو ہو سکتا ہے کہ آج فقط سختی سے چھڑانے کیلئے موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ کی سختی اسرائیلی نے اپنے لئے بھی محسوس کی ہو اور کہنے لگا کہ کل والے آدمی کی طرح مجھے قتل کرنا چاہتا ہے)۔ (مظہری)

اس تفسیر سے یہ اشکال باقی نہیں رہتا

لیکن مشہور تفسیر یہ ہے یہ جملہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسرائیلی کو کہا تو اس سے

Marfat.com

یہ مطلب نہیں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اسرائیلیوں کو مظلوم نہیں جانتے تھے، بلکہ یہ ہو سکتا ہے کہ یہ مخصوص اسرائیلی جو دوسرے روز بھی کسی دوسرے قبطی سے الجھا ہوا تھا، شاید موسیٰ علیہ السلام نے اس کی بھی سرکشی دیکھی ہو، جب کہا "اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ" لیکن قبطی کا ظالم ہونا تو ظاہر تھا اسلئے قبطی کو پکڑ کر چھڑانے کیلئے ہاتھ بڑھایا، اسرائیلی نے بڑھتا ہوا ہاتھ اپنی طرف سمجھ کر راز کو فاش کر دیا۔

اگر مظلوم قوم کا کوئی آدمی سرکشی اور زیادتی اختیار کرے تو منصف مزاج آدمی کو حق ہے کہ اس کی زیادتی کی بھی نشاندہی کرے لہٰذا یہاں اس اسرائیلی کو اس اعتبار سے یہ جملہ کہہ کر متنبہ کیا گیا۔ واللہ اعلم بالصواب

تیسری بحث: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ سے انی اَخَافُ ان یکذبُون کہنا

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیغام نبوت دے کر فرمایا کہ جاؤ ظالم (فرعونیوں) کے پاس، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ کہنا "انی اخاف ان یکذبون ویضیق صدری ولا ینطلق لسانی" کہ میں ڈرتا ہوں کہ مجھے جھٹلادیں اور میرا سینہ تنگ ہو جائے اور میری زبان نا چلے اور آپ ہارون کو نبوت دیں، وغیرہ ایسے الفاظ کہنا نبوت سے بے پرواہی ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمت اور اس کے حکم سے اعراض کے مترادف ہے۔

وضاحت: کوئی پیغمبر اپنے مولائے کریم سے استغناء نہیں کر سکتا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ کہنا کہ نبوت و رسالت سے لاپرواہی کے طور پر نہیں تھا۔ بلکہ ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے بھائی کا تعاون چاہتے تھے۔ لہٰذا بھائی کو اعزازِ نبوت میں شامل کرنے کیلئے اللہ رب العزت کے حضور دست بدعا ہوئے اور یہ مفہوم آیت سے بخوبی واضح نظر آتا ہے۔ "واجعل لی وزیراً من اھلی ھارون اخی"

"میرے لئے میرے کنبہ میں ایک معاون بنادے ہارون کو جو میرا بھائی ہے۔"

پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس سوال کو شرفِ قبولیت فرماتے ہوئے جواب دیا:

Marfat.com

قد اوتیت سؤلك یا موسیٰ۔

"اے موسیٰ تیری درخواست منظور ہوگئی۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سوال تھا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے گویا کہ اس درخواست کی اجازت دے دی گئی تھی۔ فلا اشکال فیہ

(استفادہ: عصمت الانبیاء)

چوتھی بحث: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جادوگروں کو جادو دکھانے کی اجازت کیوں دی؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جادوگروں کو اپنے جادو پیش کرنے کی کیسے اجازت دے دی جبکہ جادو کفر اور دجل وفریب ہے پیغمبر ہو کر کیسے اپنے سامنے کفر لانے کی اجازت دیتا ہے؟

وضاحت: توجیہ ۱: یہ مناظرہ و مجادلہ تھا، حق و باطل کے درمیان تمیز اسی پر موقوف تھی لہٰذا شبہات کو دور کرنے کیلئے یہ ضروری تھا۔

توجیہ ۲: یہ حکم مشروط تھا حق ہونے کے ساتھ یعنی اگر تم حق پر ہو تو رسیاں اور لاٹھیاں ڈال دو جیسا کہ اس طرح مشروط حکم سورۃ بقرہ میں ہے۔

فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ لے آؤ ایک سورہ قرآن جیسی یعنی اگر تم قدرت رکھتے ہو تو لے آؤ۔ (عصمت الانبیاء)

پانچویں بحث: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سانپ اور فرعونیوں سے ڈرنا؟

"فَاَوْجَسَ فِیْ نفسہٖ خیفۃ موسیٰ" پھر حضرت موسیٰ نے اپنے دل میں ڈر محسوس کیا۔

وَاَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ۚ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۗ اِنِّیْ لَا يَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ۔ (سورۃ نمل آیت ۱۰)

ترجمہ: پھر جب دیکھا اسکو پھنپھناتے جیسے سانپ کی سٹک، لوٹا پیٹھ پھیر کر اور مڑ کر نہ دیکھا (تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا) اے موسیٰ مت ڈر میں جو ہوں میرے پاس نہیں ڈرتے رسول۔

Marfat.com

فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ قَالَ رَبِّ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ

(سورہ قصص آیت ۲۱)

ترجمہ: پھر نکلا وہاں سے ڈرتا ہوا راہ دیکھتا بولا اے رب بچالے مجھ کو۔

حضرت موسیٰ پیغمبر ہو کر مخلوق سے ڈرتا ہے حالانکہ لایخشون احدا لا اللہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء مخلوق سے نہیں ڈرتے نیز لاٹھی کا سانپ بننا تو بطور معجزہ کے تھا، تو کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان معجزات پر اعتبار نہیں تھا؟

وضاحت: توجیہ ا: جہاں تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعونیوں سے ڈرتے ہوئے شہر سے نکلنے کی بات ہے تو اس میں جو ڈر ہے وہ طبعی اور فطری ہے اور فطری خوف منافی نبوت نہیں ہے۔ انبیاء علیہم السلام جو اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کے اظہار و اشاعت میں ذاتی ضرر پہنچنے سے وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی کی پرواہ نہیں کرتے۔

باقی لاٹھی کا سانپ بننے سے جو خوفزدہ ہوئے تو اس کی توجیہ حکیم الامت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ڈر جانا بعض نے کہا ہے کہ طبعی ہے، جو کسی طرح جلالت شان کی منافی نہیں اور بعض نے کہا ہے کہ جو حادثہ مخلوق کی جانب سے ہو اس میں تو نہ ڈرنا کمال ہے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام آتش نمرودی سے نہیں ڈرے، جو امر خالق کی طرف سے ہو اس میں ڈرنا ہی کمال ہے کہ وہ فی الحقیقت حق تعالیٰ سے ڈرنا ہے جیسے ہوا تیز ہونے کے وقت جنابِ رسول ﷺ کا گھبرا جانا احادیث میں آیا ہے، سو اس تبدل (یعنی لاٹھی کا سانپ بننے) میں مخلوق کا واسطہ نہ تھا اس لئے اس سے ڈر گئے کہ یہ کوئی قہر الٰہی نہ ہو اور دوسری آیت میں انک من الآمنین فرمانے سے تسلی دینا اس طرف مشیر ہے۔ واللہ اعلم (مظہری، قصص القرآن، بیان القرآن)

توجیہ ۲: فاوجس فی نفسہ خیفۃ موسیٰ (سورہ طٰہٰ آیت ۶۷)

پھر پانے لگا اپنے جی میں ڈر موسیٰ۔

Marfat.com

موسیٰ علیہ السلام کا یہ ڈرنا معجزات پر عدم اعتماد کی وجہ سے بالکل نہ تھا بلکہ جب انہوں نے سحر کی ظاہری آب و تاب اور قوت دیکھی تو ان کو یہ خطرہ ہوا کہ اس سے بعض لوگوں پر حق و باطل میں اشتباہ و تلبیس ہو گی، اسلئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا لاتخف انك انت الاعلی۔ ڈر مت بیشک تو ہی غالب ہو گا۔ (عصمت الانبیاء)

چھٹی بحث: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے زبور کی تختیاں کیوں پھینکیں؟

وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ

اور ڈال دیں وہ تختیاں اور پکڑا سر اپنے بھائی کا، لگا کھینچنے اس کو اپنی طرف۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام صاحبِ شریعت ہو کر اللہ تعالیٰ کی مقدس کتاب توریت کیسے پھینک رہے تھے؟

وضاحت ا: حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر سے یہ تو تصور ہی نہیں ہو سکتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو اس طرح زمین پر پھینک دیں اس لئے یہاں القاء محض صورتاً ہے، اصل بات یہ تھی کہ یہ دینی حمیت و غیرت کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اس قدر شدتِ غضب میں آکر بے بس ہوئے یہاں تک کہ ان کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور الواح توراۃ زمین پر گر پڑیں۔ والصواب ان يقال اِنَّهٗ عليه السلام لفرط حميته الدينة وشديد غضبه لله تعالىٰ لم يتمالك ولم يتماسك ان وقعت الالواح من يده بدون اختيار۔ (روح المعانی ج ۵ ص ۶۷ مطبع امدادیہ ملتان)

بعض مفسرین نے لکھا کہ مجازاً اور تشبیہاً جلدی سے رکھ دینے کو اَلْقٰی سے تعبیر فرما دیا گیا ہے۔

ساتویں بحث: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کی داڑھی پکڑ کر گناہ کیا

اسی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام سے گناہ صادر ہوا تھا، جب

Marfat.com

ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں تنبیہ کرتے ہوئے ان کی داڑھی پکڑ رہے ہیں، تو حضرت ہارون علیہ السلام منصب نبوت پر فائز ہوتے ہوئے کس طرح گناہ میں ملوث ہوئے، اگر حضرت ہارون علیہ السلام گناہگار نہیں تھے جیسے وہ اپنا عذر پیش کرتے ہیں تو پھر ماننا پڑیگا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام گناہگار تھے جو ایک پیغمبر کی داڑھی اور سر کے بال تک اپنا ہاتھ لمبا کرتے ہیں جبکہ انکا عذر بھی درست ہے۔

وضاحت: توجیہ ا: جو حضرات انبیاء علیہم السلام سے صغیرہ گناہ صادر ہونا جائز تصور کرتے ہیں وہ اس واقعہ کو صغیرہ پر محمول کرتے ہیں اور جو حضرات انبیاء علیہم السلام سے صغیرہ گناہ بھی ہونا نہیں مانتے، تو وہ دونوں پیغمبروں کو مجرم اور گناہگار تسلیم نہیں کرتے بلکہ وہ اس واقعہ میں دونوں کے فکر کو اجتہاد پر حمل کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اجتہادی فکر یہ تھی کہ گوسالہ کی پرستش وقت حضرت ہارون علیہ السلام کو، گوسالہ کی پرستش نہ کرنے والے بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر میرے پیچھے کوہ طور پر آنا چاہیے تھا اور حضرت ہارون علیہ السلام کا اجتہاد یہ تھا کہ اگر اس وقت قوم کے ساتھ سختی کی جاتی اور اس طرح بنی اسرائیل کو علحدہ کیا جاتا تو اور زیادہ نقصان ہوتا اور قوم تقسیم ہوجاتی، اختلاف میں شدت ہوجاتی اور انہوں نے یہ امید دیکھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آنے سے ان لوگوں کی اصلاح ممکن ہے، اس لئے حضرت ہارون علیہ السلام نے عذر کرتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس طرف توجہ کروائی فرمایا:

لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي ۖ إِنِّي خَشِيتُ أَنْ تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِي (طٰہٰ آیت ۹۴)

رہی یہ بات کہ آخر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام سے اتنی سختی کیوں برتی؟ تو اس کیلئے عرض ہے کہ توحید کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کیلئے بے اختیار، شدت غضب اور دینی حمیت کی وجہ سے سرزد ہوئی۔ لیکن جب حضرت ہارون علیہ السلام کا عذر معقول دیکھا کہ قوم نے ان کو کمزور کیا اور ان کو قتل کرنے تک آمادہ ہوئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے لئے اور حضرت ہارون علیہ السلام کیلئے اللہ کے حضور دعا کی۔

Marfat.com

رب اغفرلی ولاخی وادخلنا فی رحمتك وانت ارحم الراحمین۔

(استفادہ: بیان القرآن، معارف القرآن، جواہر القرآن)

توجیہ ۲: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا غضب چونکہ اللہ تعالیٰ کیلئے تھا اسلئے اس کی مثال مباح نشہ کی سی ہوگی جس میں انسان معذور شمار کیا جاتا ہے اور مکلف نہیں رہتا۔ نفسانی غصہ کو اس پر قیاس نہیں کیا جاتا وہ حرام نشہ کی طرح حرام ہی رہتا ہے۔ شرعاً اس کو عذر تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ غرضیکہ اس جوش و جلال کی حالت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام بے قابو ہوگئے جس کی وجہ سے توراۃ ایک طرف کردی اور اپنے بڑے بھائی پر دست درازی فرمادی اور اس طرح کہ غلبہ حال کی کیفیت کبھی کبھی انبیاء علیہم السلام کو بھی پیش آئی ہے جو ان کے کمال کے منافی نہیں، اسلئے کوئی شبہ نہیں ہونا چاہئے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس جلال کیفیت میں یہ دھیان ہی نہ رہا ہو کہ میری ہاتھ میں کیا ہے اور چونکہ بھائی کو نگہداشت اور نگرانی کا ذمہ دار بنا گئے تھے، اسلئے ان کی طرف سے سستی کا شبہ کرکے ان سے دارو گیر کرنے کیلئے جلدی ہاتھوں کو کھالی کرنا چاہا اور جھٹک کر تختیوں کو ایک طرف رکھ دیا جس کو اَلْقَی سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ اسی میں بھائی کے مرتبہ کا خیال بھی نہ رہا کہ کس پر ہاتھ ڈال رہا ہوں۔ اکثر کسی دلچسپ بات چیت میں مست ہونے کی وجہ سے یا کسی خیال کے پوری طرح سوار ہوجانے کے وقت ایسے اتفاقات پیش آجایا کرتے ہیں۔ (کمالین سورہ الاعراف)

آٹھویں بحث: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت خضر علیہ السلام کے طرز عمل پر اعتراض کرنا

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق کہتے ہیں کہ حضرت خضر علیہ السلام کے طرزِ عمل پر اعتراض کرتے ہوئے فرمایا، "لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا إِمْرًا" اور فرمایا "لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُكْرًا" یعنی آپ نے بہت ہی منکر اور نامعقول کام کیا ہے، غیر منکر کو منکر کہنا یہ تو خطا ہے تو کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام خطاکار ہیں؟

Marfat.com

وضاحت: شَیْئًا اِمْرًا کے دو معنی ہیں۔

ا۔ عجیب ۲۔ منکر یعنی خلاف شرع

دیکھیے نکراً کی معنی عجیب آتی ہے جیسا کہ عرب مجہول العلت اور عجیب و غریب چیز کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ منکر اور نکر ہے، اگر یہ معنی مراد لیے جائیں تو کوئی اعتراض ہی وارد نہ ہو گا۔

البتہ دوسری معنیٰ ہے منکر یعنی خلافِ شرع۔ اس صورت میں جواب یہ ہو گا، یہ دونوں عمل ظاہری طور پر خلاف شرع تھے اور ان دونوں اعمال کو جو بھی دیکھتا تو علت معلوم کرنے سے پہلے یقیناً ان کو خلافِ شرع ہی قرار دیتا، اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ظاہر کو دیکھتے ہوئے یوں کہا۔ (عصمت الانبیاء)

نویں بحث: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقتول لڑکے کو نفس زکیہ کہنا

حضرت موسیٰ علیہ السلام غلام کے بارے میں فرماتے ہیں "قتلت نَفْساً زَكِيَّةً" یعنی آپ ایک معصوم اور پاک جان کو قتل کر چکے ہیں۔ جبکہ حضرت خضر علیہ السلام کے جواب کے اعتبار سے وہ نفسِ زکیہ نہ تھا تو حضرت موسیٰ اسے کیسے پاک قرار دے رہے ہیں۔

وضاحت: توجیہ ا: ظاہر کے اعتبار سے کہا تھا کیونکہ وہ صغیر تھا۔

توجیہ ۲: یہ بطورِ استفہام کے کہا گیا ہے، اخبار کے طور پر نہیں ہے۔

(عصمت الانبیاء)

دسویں بحث: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لاتؤاخذنی بما نسیت کہنا

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا لاتؤاخذنی بما نسیتُ یعنی میرے بھول جانے پر گرفت نہ کیجیے، اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھول جانے والے پیغمبر تھے تو صاحبِ شریعت میں نسیان کی علت ہو تو پھر اس کی شریعت کا کیا بنے گا؟

دوسری بات یہ کہ نسیت کا لفظ دلالت کرتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دوسرا

Marfat.com

اور تیسرا سوال عمداً آگیا ہے نہ کہ بھول میں تو یہ کیسے ہوا کہ جبکہ لاتؤاخذنی بما نسیتُ کے جملہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام وعدہ کرچے ہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وعدہ کہ خلاف ورزی کی۔

وضاحت: جہاں تک نسیان کا تعلق ہے تو اس کا انبیاء علیہم السلام سے شرعی احکام و تبلیغ دین میں صدور نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دین کی وجہ سے حفاظت ہوتی ہے، باقی غیر دین کے معاملات میں بھول جانا انبیاء علیہم السلام سے ممکنات میں سے ہیں، ایسے واقعات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پیش آئے ہیں۔

باقی یہ بات کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر سے سوال نہ کرنے کا وعدہ کر چکے تھے پھر انہوں نے وعدہ کی خلاف ورزی کیوں کی؟ تو اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ بظاہر تو آپ کا وعدہ عام تھا، لیکن در حقیقت مراد یہ تھی کہ خلافِ شرع کوئی بات اگر پیش نہ آئی تو خاموش رہیں گے، پھر جب حضرت خضر علیہ السلام کا بچہ کے ساتھ معاملا بظاہر سراسر خلافِ شریعت نظر آیا تو صاحبِ شریعت پیغمبر اس پر کیسے خاموش رہ سکتا۔

(استفادہ: کمالین اردو شرح جلالین)

Marfat.com

حضرت خضر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق ابحاث

بحث اول: حضرت خضر علیہ السلام کا مسکینوں کی کشتی توڑنا

وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ﴿۷۹﴾۔ (سورہ کہف، ۷۹)

اور انکے پیچھے تھا ایک بادشاہ جو لے لیتا تھا ہر کشتی کو چھین کر۔

سوال یہ ہوتا ہے کہ جب ظالم بادشاہ کی حدود سے بچ کر نکل چکے تھے تو پھر کشتی کو حضرت خضر نے کیوں توڑا جبکہ بچ کر نکلنے کہ وجہ سے ظالم بادشاہ کا سامنا ہی نہ تھا۔

وضاحت: توجیہ ۱: کشتی والے اس مرتبہ تو بچ کر نکل گئے تھے لیکن پھر ان کشتی والوں کو اس طرف واپس ہونا تھا، اس وجہ سے فرمایا وراء ھم ملک کہ ان کے پیچھے ظالم بادشاہ ہے جو ان کی کشتی چھین لے گا۔

توجیہ ۲: وراءَ بمعنی اَمَام کے ہیں یہ زی اضداد ہے یعنی آگے، سامنے ظالم بادشاہ کی حدود میں داخل ہونا ہے اور وہ تمام اچھی کشتیوں کو لوٹ لینے والا ہے۔

جیسے فرمایا گیا ہے وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ جَهَنَّمُ یعنی ان کے آگے جہنم ہے ظاہر ہے کہ ابھی جہنم کی سزا کسی کو نہیں پہنچی ہے، وہ تو دنیا کے بعد آخرت میں ہو گی۔

دوسری بحث: حضرت خضر کا نابالغ لڑکے کو قتل کرنا، کیا حکمت تھی؟

اللہ عزوجل کا فرمان ہے

وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا

(سورہ الکہف آیت ۸۰)

Marfat.com

ترجمہ: اور وہ جو لڑکا تھا سو اُس کے ماں باپ تھے ایمان والے پھر ہم کو اندیشہ ہوا کہ انکو عاجز کر دے زبردستی اور کفر کر کر۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حدیث شریف ہے کہ ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے، نیز لفظ غلام دلالت کرتا ہے کہ وہ لڑکا نابالغ بچہ ہی تھا تو حضرت خضر علیہ السلام نے ایک اندیشہ اور خطرہ کی بنا پر کس طرح معصوم بچہ کو قتل کیا جو قتل ہونے کے وقت تک کفر اور دوسرے گناہ سے معصوم تھا۔

وضاحت: توجیہ ا: یہ بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا تو ہوا تھا، لیکن بجائے اسلام کے کفر کے قبول کرنے کے امکانات زیادہ قوی تھے پھر یہ کفر اس حد تک پہنچا کہ ماں باپ بھی اس کے کفر کی بنا پر مبتلائے کفر ہو سکتے تھے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کو اس کے ماں باپ کے ایمان کی حفاظت مقصود تھی، اسلئے اس بچہ کو ختم کر دینا ضروری تھا بالکل اسی طرح جیسا کہ جسم کا کوئی عضو خراب ہونے کے صورت میں پورے جسم کے متاثر ہونے کے امکانات ہوں تو اس عضوِ فاسد کو کاٹ دیا جاتا ہے۔

توجیہ ۲: حضرت خضر علیہ السلام کا یہ اندیشہ محض عقلی نہ تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت خضر علیہ السلام کے پاس وحی آگئی تھی کہ اگر یہ لڑکا زندہ رہا تو اس کے مومن ماں باپ گمراہ ہو جائیں گے اور وہ دونوں کو گمراہ ہو جانے پر مجبور کر دے گا یہ دلیل آیت سے لی جاتی ہے وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ اَمْرِیْ الایۃ۔

ابن ابی شیبہ نے زید بن ہرمز کی روایت سے بیان کیا ہے کہ نجدہ خارجی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس ایک تحریر بھیجی جس میں یہ سوال کیا کہ حضرت خضر نے لڑکے کو کیسے قتل کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو لڑکوں کو قتل کرنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جواب میں لکھا اگر تجھے لڑکوں کی آئندہ حالت کا ایسا ہی علم ہو جائے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علم والے ساتھی (حضرت خضر) کو تھا تو تیرے لئے بھی بچوں کو قتل کرنا جائز ہو جائے گا، آپ کی مراد یہ تھی کہ عام مسلمانوں کے پاس تو وحی نہیں آتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد

Marfat.com

سلسلہ وحی منقطع ہو چکا ہے، اب اس امتِ اسلامیہ کیلئے بچوں کو قتل کرنا جائز نہیں ہے۔ اور حضرت خضر علیہ السلام کے پاس وحی آئی تھی اور ان کو حکم دیا گیا تھا، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت حضرت خضر علیہ السلام پر لاگو نہیں ہے۔

(استفادہ: کمالین شرح اردو جلالین، مظہری)

تیسری بحث: کشتی۔ کے مالک ہونے کے باوجود وہ مسکین کیسے؟

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

اَمَّا السَّفِیْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِیْنَ یَعْمَلُوْنَ فِی الْبَحْرِ

(سورۃ الکہف آیت ۷۹)

وہ جو کشتی تھی سو چند محتاجوں کی جو محنت کرتے تھے دریا میں۔

کشتی یا بحری جہاز بڑی مالیت کا سرمایہ ہوتا ہے تو اس کے مالک کو حضرت خضر علیہ السلام مسکین کیسے کہتے ہیں۔

وضاحت: بعض حضرات کہتے ہیں کہ وہ کشتی پوری قوم کی ملکیت تھی، ہو سکتا ہے کہ ہر ایک کے حصہ میں بہت ہی تھوڑا مال آتا ہو۔ تفسیر مظہری نے کعب کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ کشتی دس غریب بھائیوں کی تھی ان میں پانچ تو اپاہج تھے اور پانچ کام کرتے تھے، اس اعتبار سے آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ مسکین کا اطلاق اس شخص پر بھی ہوتا ہے جس کے پاس مال تو ہو مگر ناکافی ہو، بقدرِ ضرورت نہ ہو یا اصلی ضرورتوں سے زائد نہ ہو۔

Marfat.com

ابحاث حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق

وَ هَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ﴿۲۱﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلٰى دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ
قَالُوْا لَا تَخَفْ ۚ خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَ لَا تُشْطِطْ وَ اهْدِنَآ
اِلٰى سَوَآءِ الصِّرَاطِ ﴿۲۲﴾ اِنَّ هٰذَآ اَخِيْ ۫ لَهٗ تِسْعٌ وَّ تِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِيَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ ۫
فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا وَ عَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ ﴿۲۳﴾ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ ؕ وَ
اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ
قَلِيْلٌ مَّا هُمْ ؕ وَ ظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَ خَرَّ رَاكِعًا وَّ اَنَابَ ﴿۲۴﴾

(سورہ ص ۲۱ تا ۲۴)

ترجمہ: اور پہنچی ہے تجھ کو خبر دعوے والوں کی جب دیوار کود کر آئے عبادت خانہ میں جب گھس آئے داؤد کے پاس تو ان سے گھبرایا، وہ بولے مت گھبرا ہم دو جھگڑتے ہیں زیادتی کی ہے ایک نے دوسرے پر سو فیصلہ کردے ہم میں انصاف کا اور دور نہ ڈال بات کو اور بتلادے ہم کو سیدھی راہ یہ جو ہے بھائی ہے میرا اس کے یہاں ہیں ننانوے دنبیاں اور میرے یہاں ایک دنبی، پھر کہتا ہے حوالے کردے میرے وہ بھی اور زبردستی کرتا ہے مجھ سے بات میں بولا وہ بے انصافی کرتا ہے تجھ پر کہ مانگتا ہے تیری دنبی ملانے کو اپنی دنبیوں میں اور اکثر شریک زیادتی کرتے ہیں ایک دوسرے پر مگر جو یقین لائے ہیں اور کام کئے نیک اور تھوڑے لوگ ہیں ایسے اور خیال میں آیا داؤد کے کہ ہم نے اس کو جانچا پھر استغفار کرنے لگا اپنے رب سے پھر گر پڑا جھک کر اور رجوع ہوا۔ (ترجمہ شیخ الہند)

Marfat.com

بحث اول: کیا حضرت داوٗد علیہ السلام اوریا کی بیوی پر عاشق ہوئے تھے؟ معاذاللہ

بہت سے مفسرین عظام نے اس آیات کی تفسیر میں ایک حکایت بیان کی ہے کہ ایک دن حضرت داوٗد علیہ السلام نے ایک باغ میں تالاب کے کنارہ پر ایک عورت کو غسل کرتے ہوئے دیکھا تو وہ حضرت داوٗد کو بہت ہی حسین لگی اس کا حسن حضرت داوٗد کے دل کو شکار کر گیا، غسل کے بعد جب اس نے کپڑے پہنے تو اور زیادہ حضرت داوٗد کو اچھی لگی، یہ عورت اُوریَا بن حنانا کی بیوی تھی اور اوریا حضرت داوٗد علیہ السلام کے بھانجے ایوب بن صوریا کے ساتھ بلقاء کی جنگ میں گیا ہوا تھا۔ تو حضرت داوٗد علیہ السلام نے ایوب بن صوریا کو لکھا کہ اوریا کو تابوت کے ساتھ فلاں جگہ پر روانہ کیجئے اور اصول یہ تھا کہ جس کو تابوت کے ساتھ روانہ کیا جاتا تھا تو اس کے لیے بغیر فتح کیے یا بغیر شہادت پانے کے واپس ہونا حرام تھا لہٰذا اوریا کو ایسی جگہ روانہ کیا گیا، اوریا نے فتح پائی، ایوب بن صوریا نے حضرت داوٗد کو لکھا کہ اس نے فتح پائی ہے تو حضرت داوٗد نے لکھا کہ اسی طرح اس کو فلاں فلاں دشمن کے مقابلہ میں بھیجو، پھر اس نے فتح پائی، پھر لکھا کہ اس کو سخت ترین دشمن کے مقابلہ میں بھیجو، اب تیسری بار یہ شہید ہو گیا جب عدت گذر گئی تو حضرت داوٗد علیہ السلام نے اس عورت سے شادی کر لی۔

اس حکایت کو تفسیر خازن سے بطور خلاصہ نقل کیا ہے ویسے اس واقعہ کو مختلف طُرُق سے نقل کیا گیا ہے، بعض نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ حضرت داوٗد علیہ السلام نے نکاح سے پہلے صحبت بھی کر لی تھی (معاذاللہ) اور وہ اس صحبت سے حاملہ ہو گئی، لیکن مسلمانوں نے ایسے جملوں کو حذف کر کے بیان کیا ہے۔

پس یہ حضرت داوٗد علیہ السلام کا گناہ تھا کہ ننانوے بیویوں کی موجودگی میں اوریا کی بیوی کو اپنے گھر لایا، بہت سے مفسرین نے اس واقعہ کو حضرت داوٗد علیہ السلام پر چسپاں کرتے ہوئے مذکورہ آیات کی تفسیر کی ہے، کہ حضرت داوٗد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعہ ایک تمثیل سے متنبہ کیا۔

Marfat.com

وضاحت: حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت ان خرافات میں سے ہے، جو یہودیوں کے ذریعہ بعض مسلمانوں میں پھیل گئی تھی، سادہ لوح مسلمانوں نے اس روایت کو ان آیات کی تفسیر میں مناسب سمجھ کر بیان کرنا شروع کر دیا۔

تفسیر حقانی نے اس قصہ کا ماخذ کتاب صمویل کو کہا ہے یہ بزرگ فرماتے ہیں، "کتاب صمویل جس کی تقلید بعض حمقاءِ اسلام نے کی ہے سو آج تک اسکا پورا پتہ اہل کتاب کو بھی نہیں ملتا کہ اس کا کون مصنف ہے؟ وہ ایک تاریخ کی کتاب یہود میں مروج تھی، جس کو یہود و نصاریٰ نے خوامخواہ الہامی فرض کر لیا۔"

حضرت علامہ سیوہاروی ایسے سادہ مزاج مفسرین کے متعلق یوں رقمطراز ہیں۔

"ان سادہ لوح بزرگوں نے یہ مطلق خیال نہیں فرمایا کہ جن خرافی داستانوں کو آج وہ اسرائیلی روایت کی حیثیت سے قرآن عزیز کی تفسیر میں نقل کر رہے ہیں کل وہ آیات قرآن کی تفسیر و تشریح سمجھی جائے گی اور امت مرحومہ کیلئے فتنہ سامانی کا باعث بنے گی، اور ان کی گمراہی کا سبب ثابت ہو گی۔ حیرت و صد حیرت ہے بعض ان جدید و قدیم متکلمین پر، جنہوں نے اس قسم کی ھزلیات کو سختی کے ساتھ رد کرنے اور ان بہتان طرازیوں کو مردود قرار دینے کے بجائے ان روایات کے نیک محمل تلاش کر کے ان کو قابل قبول بنانے کی سعی نامشکور فرمائی ہے اور بے محل حُسنِ ظن سے کام لے کر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ یہ تاویلات جو اس خرافی روایت کے بارے میں کی جا رہی ہیں، ریت کی دیوار اور تارِ عنکبوت ہیں اور کسی نہ کسی اسلوب اسلامی عقیدہ پر ضرب کاری لگتی ہے، اور یہ کہ انبیاء و رسل کی جانب اس قسم کے انتساب سے جبکہ قرآن عزیز کا دامن پاک اور بے لوث ہے، اور وہ اس قسم کی روایات کو بہتانِ عظیم سمجھتا ہے تو پھر کسی شخص کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کی تفسیر میں اس قسم کی خرافات کا تذکرہ کرے۔"

علامہ حافظ عماد الدین بن کثیرؒ اپنی تفسیر ابن کثیر میں فرماتے ہیں۔

قد ذکر المفسرون ھاھنا قصة اکثرھا مأخوذ من اسرائیلیات ولم یثبت فیھا عن

Marfat.com

المعصوم حدیث یجب اتباعه (ابن کثیر ج ۴ ص ۴۱)

اس جگہ مفسرین حضرات نے ایک ایسا قصہ بیان کیا ہے جس کا اکثر حصہ بلاشبہ اسرائیلیات سے لیا گیا ہے اور اس بارے میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث بھی مروی نہیں ہے کہ جس کی پیروی ضروری ہو جائے۔

علامہ علاؤالدین علی خازنؒ ایک طرف تو اس واقعہ کو اپنی تفسیر میں ذکر کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ حضرت داؤد علیہ السلام کی صفائی میں ایک فصل بھی قائم کرتے ہیں۔ "فصل فی تنزیه داؤد علیه الصلوٰة والسلام عما لا یلیق به" اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان نقل کرتے ہیں۔

اِنَّهٗ قال مَنْ حَدَّثکم بِحدیث داؤدَ علیٰ مایرویہِ القُصّاصُ جَلَدتهٗ مِائَةً وَّسِتِّیْنَ جَلْدَةً وَهُوَحَدُّ الفِرِیَّةِ عَلَى الاَنْبِیَاءِ۔ (خازن ج ۴ ص ۳۸)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو آدمی آپ لوگوں کو حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق یہ بات بتائے گا جس کو یہ قصہ گو آدمی بیان کرتے ہیں تو میں اس کو ایک سو ساٹھ درے ماروں گا اور یہ سزا ہے انبیاء علیہم السلام پر جھوٹ باندھنے کی (اس میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے انبیاء علیہم السلام پر افتراء باندھنے کی سزا دگنی ہے کیونکہ عام آدمی پر بہتان باندھنے کی سزا اسی دُرے مقرر ہے)

اسی فصل میں لکھتے ہیں:

قال الامام فخر الدین حاصل القصة یرجع الی السعی فی قتل رجل مسلم بغیر حق والی الطمع فی زوجته کلاهما منکر عظیم فلا یلیق بعاقل ان یظن بداؤد علیه الصلوٰة والسلام هٰذا۔ (خازن ص ۳۸ ج ۴ مطبع حافظ کتب خانہ مسجد روڈ کوئٹہ)

امام فخر الدینؒ فرماتے ہیں اس قصہ کا ما حصل یہ ہے کہ ایک مسلمان آدمی کو ناحق قتل کی کوشش اور اس کی بیوی میں طمع رکھی گئی اور یہ دونوں بڑے گناہ کے کام ہیں کسی بھی عقلمند آدمی کو حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق ایسا گمان رکھنا مناسب نہیں۔

قصص القرآن نے البدایہ والنھایہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

Marfat.com

وقد ذکر کثیر من المفسرین من السَّلَفِ وَالْخَلَفِ ھٰھنا قصصاً وّاخبارًا اکثرھا اسرائیلیات ومنھا ماھو مکذوب لامحالة ترکنا ایرادھا فی کتابنا قصداً اکتفاءً وَاقْتِصَارًا علیٰ مجرد تلاوة القصه من القرآن العظیم واللہ یھدی من یشاءُ الیٰ صراطٍ مستقیم۔

اور بہت سے اگلے اور پچھلے مفسرین نے اس مقام پر چند قصے اور حکایتیں نقل کی ہیں، ان میں سے اکثر و بیشتر یہودیوں کی من گھڑت روایتیں ہیں اور بعض ان میں سے یقینی طور پر جھوٹی اور باطل ہیں ہم نے اسلئے ان کو قصداً بیان نہیں کیا اور قرآن عظیم نے جس قدر واقعہ بیان کیا ہے صرف اسی قدر بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے راہِ مستقیم پر چلاتا ہے۔

اسی طرح حافظ ابو محمد بن حزم کا قول نقل کرتے ہیں۔

وھٰذا قول صادق صحیح لایَدُلُّ علیٰ شَیْءٍ مِمَّا قاله الْمُسْتَھْزِئُوْنَ الکَاذِبُوْنَ الْمُتَعَلِّقُوْنَ بِخرافاتٍ وَلَّدَھَا الیَھُوْدُ۔

اور قرآن کریم کا یہ قول سچا اور صحیح ہے اور یہ کسی طرح بھی اس روایت پر دلالت نہیں کرتا جس کو ان مسخروں، کاذبوں نے بیان کیا ہے جو ایسی خرافات سے لپٹے رہتے ہیں جن کو یہود نے ایجاد کیا ہے۔

ان تمام باتوں کے ساتھ جب قرآن کریم کے سیاق و سباق کو دیکھا جاتا ہے تو حضرت داؤد علیہ السلام کے وہ اعلیٰ درجے کے اچھے اوصاف سامنے آتے ہیں جن کو اللہ رب العزت بیان فرما رہے ہیں۔

۱۔اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ

یعنی بار بار اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا، جس شخصیت میں ایسی صفت ہو تو محال ہے کہ وہ بہت بڑے گناہ کا خواہشمند ہو۔

۲۔اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ معهٗ الایه، والطیر مَحْشُوْرَۃ

ہم نے پہاڑوں کو حکم کر رکھا تھا کہ ان کے ساتھ شام اور صبح تسبیح کیا کریں، جمع

Marfat.com

کیے ہوئے پرندوں کو بھی۔

تو کیا یہ اتنی بڑی طاقت اسلئے دی گئی تھی کہ وہ اسکے ذریعہ قتل و زنا میں مبتلا ہو جائے!!

اس سے بڑھ کر یہ بھی کہا گیا ہے کہ داوٗد علیہ السلام کیلئے پرندوں کا شکار حرام تھا اسی وجہ سے پرندے ان سے محفوظ تھے جس سے پرندے محفوظ ہوں، کیا اس سے ایک مسلم اپنی عزت و آبرو کے حوالے سے مامون و محفوظ نہ ہوگا؟ (ضرور ہوگا)

۳۔ وَاٰتَیْنٰہُ الْحِکْمَۃَ

اور ہم نے اسے حکمت دی (نبوت دی)

حکمت ایک جامع اسم ہے ہر اس چیز کو شامل ہے جو علم و عمل کے اعتبار سے مناسب ہو اور فہم و فراست، عقل و حکمت سے نوازا گیا ہو اس سے ایسے قبیح ترین فعل کا صدور محال ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی میں حکمت والی صفت بھی ہو اور اس قسم کی خباثت بھی ہو۔

۴۔ یا داوٗد اِنَّا جَعَلْنٰکَ خلیفۃ

اے داوٗد ہم نے تجھے خلیفہ بنایا۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خلافت جیسا عظیم اعزاز عنایت کرے، نیابت عطا کرے، اور وہ آدمی اس قوت و نعمت کو قتل و فسق فجور میں استعمال کرے۔

۵۔ اِنَّآ اَخْلَصْنٰھُمْ بخالصۃ ذکری الدار وانھم عندنا لمن المصطفین الاخیار۔

بیشک ہم نے انہیں ایک خاص فضیلت دی، یعنی ذکر آخرت کیلئے چن لیا تھا اور بیشک وہ ہمارے نزدیک برگزیدہ اور نیک بندوں میں سے تھے۔

۶۔ وَاِنَّ لَہٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰی وَحُسْنَ مَاٰبٍ

اور اس کیلئے ہمارے ہاں مرتبہ اور اچھا ٹھکانہ ہے۔

کیا اللہ تعالیٰ کے اتنے مقرب بندے سے عشق اور قتل صادر ہو سکتا ہے؟ ذکر کردہ اوصاف پاکیزہ اور اللہ کی ذات سے تعلق والے اوصاف ہیں، یقیناً ایسے اوصاف کا

Marfat.com

مالک کبیرہ گناہ، فحاشی کا ارتکاب نہیں کر سکتا، یہ باتیں حضرت داؤد علیہ السلام کے پاکدامن ہونے کیلئے مُبیَّن ثبوت ہیں۔

اس حکایت کے من گھڑت ثابت ہونے کے بعد اب آتے ہیں آیات کی صحیح تفسیر کی طرف۔ اس سلسلہ میں حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جو کچھ لکھا ہے وہ نہایت ہی موزون و مناسب نظر آتا ہے۔ آیئے ملاحظہ کیجئے۔

اور داؤد علیہ السلام کو خیال آیا کہ اس واقعہ کے پیش آنے میں حکمت یہ ہے کہ ہم نے (اللہ تعالیٰ نے) ان کا امتحان کیا ہے۔ کہ دیکھیں یہ کیسے صابر و متحمل ہیں کیونکہ ایسے بڑے جلیل القدر سلطان کے خلوتخانہ خاص میں کسی کا بے اجازت، پھر اس بے ڈھنگے پن سے آگھسنا پھر بات چیت اس طرز سے کرنا کہ اول تو یہ کہنا کہ ڈرو مت۔ جس سے متکلم کا بڑا اور مخاطب کا چھوٹا ہونا مترشح ہوتا ہے۔ پھر یہ کہنا کہ انصاف سے فیصلہ کرنا اور بے انصافی مت کرنا جس سے ایہام ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ آپ سے بے انصافی کا احتمال ہے اور ان مضامین کے اقتران سے اھدنا۔ الایہ کا مدلول اسی کے قریب قریب مفہوم ہوتا ہے کہ ان کو احتمال اس کے خلاف کا بھی ہے، جس میں ترک واجب کا اتہام لازم آتا ہے گو مناجات میں یہ صیغہ موجب سوء ادب نہیں، اول تو مناجات و تضرع اس ایہام سے مانع ہے، ثانیاً حق تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں جس سے محذور لازم آتا ہے۔ غرض ان کا مجموعہ اقوال و افعال نہایت درجہ گستاخی در گستاخی ہے پس اس میں داؤد علیہ السلام کے تحمل و صبر کا امتحان ہو گیا کہ آیا زور سلطنت میں ان متواتر گستاخیوں پر دارو گیر کرتے ہیں اور اس مقدمے کو ملتوی کر کے ان پر دوسرا مقدمہ (توہین، عدالت کا) قائم کرتے ہیں یا غلبہء نور نبوت سے عفو فرماتے ہیں اور اس مقدمہ کو کمال عدل سے بلاشائبہ غیظ و غضب فیصل کرتے ہیں؟ چنانچہ امتحان میں صابر ثابت ہوئے اور مقدمہ کو نہایت ٹھنڈے دل سے سماعت اور فیصل فرمایا، لیکن انبیاء کی جلالت شان عدل کے جس درجہ علیا و ذروہ قصوی کو مقتضی ہے اس سے بظاہر ایک گونہ بعید اتنا خفیف سا یہ امر پیش آگیا کہ بعد قیام برھان شرعی کہ وہ بینہ (گواہ) ہو یا اقرار بجائے اس کے کہ وہ صرف ظالم

Marfat.com

سے یہ خطاب فرماتے کہ تونے ظلم کیا اس مظلوم سے خطاب فرمایا کہ تجھ پر ظلم کیا، جس سے ایک صورت طرفداری کی متوہم ہوتی ہے اور گو مظلوم ہونے کی حیثیت سے یہ طرفدار بھی عبارت ہے، خصوص مقدمہ ختم ہو چکنے کے بعد، لیکن فریق مقدمہ ہونے کے حیثیت اور عدم تبدل مجلس تخاصم اور مجلس واحد کے جامع المتفرقات ہونے کی حیثیت سے اس متوہم طرفداری کا بھی نہ ہونا اعدل واکمل تھا، سو داؤد علیہ السلام غایت تقوی سے اتنی بات کو بھی مُخِلُّ مال صبر ومنافی ثبات فی الامتحان سمجھے اور انہوں نے اس سے بھی اپنے رب کے سامنے توبہ کی اور سجدہ میں گر پڑے اور خاص طور پر خدا کی طرف رجوع ہوئے، سو ہم (اللہ تعالیٰ) نے ان کو وہ امر معاف کر دیا، اور اس سے جو کمی ان کے اجر مرتب علی کمال الصبر میں ہوتی اس کمی کا ازالہ کر دیا اور وجہ ایسے خفیف امر پر توبہ اور سجدہ کرنے کی یہ ہے کہ ہمارے یہاں ان کیلئے خاص قرب اور اعلیٰ درجے کی نیک انجامی یعنی جنت کا درجہ علیا ہے اور مقربین اور خوش انجاموں کی یہی شان ہوتی ہے کہ تِل برابر بات کو بھی اپنے لئے پہاڑ سمجھتے ہیں جب داؤد علیہ السلام اس امتحان میں پورے اترے تو ہم (اللہ تعالیٰ) نے ان کا دل بڑھانے کو خاص طور پر خطاب فرمایا کہ اے داؤد ہم نے تم کو زمین پر حاکم بنایا ہے سو جس طرح اب تک کرتے رہے ہو اسی طرح آئندہ بھی لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے رہنا اور جس طرح اب تک کبھی نفسانی خواہش کی پیروی نہیں کی اسی طرح آئندہ بھی نفسانی خواہش کی پیروی مت کرنا کہ اگر ایسا کرو گے تو وہ خدا کے راستے سے تم کو بھٹکا دے گی اور جو لوگ خدا کے راستے سے بھٹکتے ہیں ان کیلئے سخت عذاب ہو گا اس وجہ سے کہ وہ روزِ حساب کو بھولے رہے، یہ بات اور انکو سنادی جو بھٹک رہے ہیں۔

باقی حضرت داؤد علیہ السلام کا استغفار پڑھنا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد نے کوئی کبیرہ گناہ کیا تھا، تو مذکورہ بالا تفسیر کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا استغفار پڑھنا محض "اس متوہم طرفداری" کی سبب تھا جو درحقیقت گناہ بھی نہیں ہے، بلکہ یہ حضرت داؤد علیہ السلام کی نہایت تقویٰ ہے یہ ہے ایک توجیہ۔

Marfat.com

توجیہ ۲: بعض حضرات نے استغفار کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جب وہ لوگ دیوار پر چڑھ گئے تو حضرت داؤد علیہ السلام نے خیال کیا کہ یہ میرے قتل کی غرض سے آئے ہیں لیکن جب حقیقت حال اس کے خلاف نکلی تو اپنی بدگمانی پر نادم ہو کر استغفار کرنے لگے۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر خازن، بیان القرآن، تفسیر ابن کثیر، عصمت انبیاء)

بحث ثانی: خشیت اور خوف میں فرق

اِذْ دَخَلُوْا عَلٰی دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوْا لَا تَخَفْ (ص آیت ۲۲)

جب وہ گھس آئے داؤد پر تو ان سے گھبرایا (داؤد) وہ بولے مت ڈر۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام ان لوگوں سے ڈر گئے، حالانکہ قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام کی شان یہ بیان کی گئی۔ ہے لَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ، یعنی وہ (انبیاء علیہم السلام) اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، تو حضرت داؤد علیہ السلام کو ان لوگوں سے ڈر کیسے ہوا۔

وضاحت: درحقیقت ڈرنے کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔

ایک ڈر ہوتا ہے موذی اشیاء کے تکلیف پہنچانے سے، اسے عربی میں خوف کہتے ہیں۔

دوسرا ڈر کسی بڑے کی عظمت، جلالت شان اور رعب کی وجہ سے ہوتا ہے، اسے خشیت کہا جاتا ہے۔ خشیت تو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہیں ہونی چاہئے اور انبیاء علیہم السلام کی شان یہی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ان پر کسی کی خشیت طاری نہیں ہوتی۔ (جیسے دوسرے لوگوں پر ان کے بالائی شخصیت یا بادشاہ وغیرہ کی خشیت طاری ہو جاتی ہے) باقی خوف طبعی موذی اشیاء سے ہو سکتا ہے۔ لاتخف کا لفظ بھی اسی پر دلالت کرتا ہے، طبعی خوف شانِ نبوت کے خلاف نہیں ہے، کیونکہ تمام انبیاء علیہم السلام انسان ہیں اور یہ چیز انسانیت سے طبعاً وابستہ ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی ایسا خوف ہوا تھا جب انہوں نے اپنی لاٹھی کو اژدھا بنتے دیکھا۔ (جیسے پیچھے ہم بیان کر چکے ہیں) اللہ تعالیٰ نے فرمایا خذھا ولا تخف سنعیدھا سیرتھا الاولیٰ۔ یعنی آپ اس کو پکڑ لیں اور مت ڈریے، ہم

Marfat.com

ابھی اس کو پہلی حالت پر کر دیں گے، تو یہاں موسیٰ علیہ السلام کا بھی ڈر جانا طبعی ہے جو کسی طرح جلالت شان کے منافی نہیں ہے۔ (استفادہ: معارف القرآن سے)

تیسری بحث: حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے فیصلے

وَدَاوُدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ (سورہ انبیاء آیت ۷۸)

اور داؤد اور سلیمان کا تذکرہ کیجئے جبکہ دونوں کھیت کے بارے میں فیصلہ کرنے لگے، جبکہ اس میں کچھ لوگوں کی بکریاں رات کے وقت جا پڑیں اور ہم اس فیصلہ کو جو (ان) لوگوں کے متعلق ہوا تھا دیکھ رہے تھے سو ہم نے اس فیصلہ کی سمجھ سلیمان کو دیدی اور ہم نے دونوں کو حکمت (نبوت) اور علم عطا فرمایا تھا۔

اس مقدمہ کی تفصیل اس طرح ہے کہ ایک شخص کی بکریاں کسی شخص کی کھیتی میں رات کے وقت چر گئیں، وہ کھیتی غلہ کی تھی یا انگور کا باغ تھا بہر حال کھیتی کا صفایا ہو گیا، جن کی کھیتی تھی وہ اس مقدمہ کو حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس لے گئے حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے علم و حکمت کے پیش نظر فریقین کو یہ فیصلہ دیا کہ مدعی کو تاوان دیدیا جائے۔ اور مدعی کی کھیتی کا نقصان مدعیٰ علیہ کے گلہ کی قیمت کے قریب قریب متوازن تھا لہٰذا مدعیٰ علیہ کا پورا گلہ بکریوں کا مدعی کو دلوایا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو معلوم ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ اس کا فیصلہ دوسری طرح بھی ہو سکتا ہے جو فریقین کیلئے مفید اور نافع ہو گا دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ یہ بکریاں کھیت والے کو (عارضی طور پر) دیدی جائیں اور بکریوں والے سے کہا جائے کہ وہ اس کھیت میں کام کرے یہاں تک کہ کھیت اسی حالت پر آجائے جس حال میں یہ بکریوں کے چرنے کے قبل تھی اور اس دوران یہ کھیت والا ان بکریوں کے دودھ وغیرہ سے فائدہ اٹھاتا رہے اور جب کھیت اپنی پہلی حالت پر آجائے تو کھیت والے کو کھیت واپس کر دی جائے اور بکریاں اس کے مالک کو واپس کر دی جائیں۔

Marfat.com

بحث: اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا فیصلہ صحیح نہ تھا، شریعت کے خلاف تھا، تو کیا پیغمبرِ خدا غلط فیصلہ کر سکتا ہے؟

وضاحت: اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا فیصلہ خلافِ شرع تھا، حضرت داؤد علیہ السلام کا فیصلہ عین شریعت کے مطابق تھا اور فیصلہ کی یہ تقاضا تھی، لیکن اس میں بکریوں والے کو تکلیف پہنچ رہی تھی، اسلئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے دونوں فریقوں کی رضامندی سے ایک اصلاحی تجویز فرمائی جس میں دونوں کی رعایت اور سہولت ملحوظ رکھی گئی تھی، اسلئے دونوں فیصلوں میں کوئی تعارض نہیں تھا، اسی کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے، کلا اتینا حُکماً وّعلما۔ کہ ہم نے علم و حکمت تو ان دونوں میں سے ہر ایک کو دی تھی، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ حضرت داؤد علیہ السلام کے فیصلہ سے بہتر تھا، کیونکہ اس میں دونوں کی رعایت رکھی گئی تھی، اصلاح کی گئی تھی اور قرآن کریم میں ہے والصُّلحُ خَیرٌ۔ اسلئے یہ دوسری صورت اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ٹھہری، بہرحال حضرت داؤد علیہ السلام کا فیصلہ کسی بھی طرح غلط نہیں تھا کیونکہ پیغمبرِ خدا کو تائید ایزدی حاصل ہوتی ہے۔

اما الانبیاء علیهم السلام فکلهم معصومون مؤیدون من الله عزوجل وهٰذا مما لاخلاف فیه بین العلماء المحققین من السلف والخلف (ابن کثیر ج۳ ص ۲۴۹)

تمام انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں ان کو اللہ رب العزت کی تائید حاصل ہوتی ہے، اس بات میں اگلے پچھلے محققین علماء کرام کا کوئی اختلاف نہیں ہے، لہٰذا انکا فیصلہ بھی غلط نہیں ہو سکتا۔ (استفادہ: ابن کثیر، معاف القرآن کمالین، شرح جلالین)

Marfat.com

حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق ابحاث اور ہاروت ماروت کے متعلق وضاحت

وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ عَلٰی مُلْكِ سُلَیْمٰنَ ۚ وَ مَا كَفَرَ سُلَیْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّیٰطِیْنَ كَفَرُوْا یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَ مَاۤ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَیْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ وَمَا یُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰی یَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَیَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا یُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَیْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّیْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ یَتَعَلَّمُوْنَ مَا یَضُرُّهُمْ وَ لَا یَنْفَعُهُمْ ؕ وَ لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ؕ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ۔ (سورہ بقرہ، آیت ۱۰۲)

اور پیچھے ہو لئے اس علم کے جو پڑھتے تھے شیطان سلیمان کی بادشاہت کے وقت، اور سلیمان نے کفر نہیں کیا، لیکن شیطانوں نے کفر کیا کہ سکھلاتے تھے لوگوں کو جادو اور اس علم کے پیچھے ہو لئے جو اترا دو فرشتوں پر، بابل شہر میں جن کا نام ہاروت اور ماروت ہے اور وہ فرشتے دونوں کسی کو نہیں سکھاتے تھے جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو آزمائش کیلئے ہیں سو تو کافر مت ہو پھر ان سے سیکھتے وہ جادو جن سے جدائی ڈالتے ہیں مرد میں اور اس کی عورت میں اور وہ اس سے نقصان نہیں کر سکتے کسی کا بغیر حکم اللہ کے، اور سیکھتے تھے وہ چیز جو نقصان کرے ان کا، اور فائدہ نہ کرے، اور خوب جان چکے ہیں کہ جس نے

Marfat.com

اختیار کیا جادو کو، نہیں اس کیلئے آخرت میں کچھ حصہ اور بہت ہی بُری چیز ہے جس کے بدلے بیچا انہوں نے اپنے آپ کو، اگر ان کو سمجھ ہوتی۔

اس آیت کے تفسیر مین چند باتوں کو سامنے رکھا جاتا ہے۔

(۱) حضرت سلیمان علیہ السلام پر کفر کا الزام۔

(۲) حضرت سلیمان علیہ السلام پر جادو کرنے کا الزام۔

(۳) ہاروت اور ماروت کے متعلق ایک جھوٹا قصہ۔

بحث اول: حضرت سلیمان علیہ السلام پر کفر و جادو کے الزام کا رد

یہودیوں نے جیسا کہ اپنی آسمانی کتابوں میں تحریفات کر کے مذہب کو اپنی اصل حقیقت سے بگاڑ رکھا تھا اور اس میں اپنی من مانی کے اعتبار سے انبیاء علیہم السلام کی عصمت تک کا لحاظ نہیں رکھا اس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق یہ مشہور کر رکھا تھا کہ وہ آخر عمر مین مرتد ہو گئے تھے۔ (معارف القرآن ص ۵۲، ج ۱)

اور کبھی کہتے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام خود جادو کرتے تھے اور مشہور کر رکھا تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس ایک انگشتری ایسی تھی جس کی وجہ سے تمام جن و انس ان کے تابع تھے اس لالچ میں آکر یہود نے توراۃ کو پس پشت ڈال دیا اور اس کفریات کی تعلیم و تعلم میں سرگرم ہو گئے۔

اس آیت میں اللہ رب العزت حضرت سلیمان علیہ السلام کی برأت فرماتے ہیں اور ان کی واہیانہ گفتگو کا رد فرماتے ہیں، وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ میں دونوں الزاموں کا رد ہے، کیونکہ جادو کرنا بھی کفر ہے۔ لہٰذا حضرت سلیمان علیہ السلام نہ تو مرتد ہوئے اور نہ ہی انہوں نے جادو کیا، ولٰکن الشیاطین کفروا، بلکہ یہ شیاطین لوگوں کو جادو سکھلا کر کفر بک رہے تھے۔

یہاں سوال ہوتا ہے کہ شیاطین سے مراد کون ہیں؟ تو اس کے لئے عرض یہ ہے کہ اس سے مراد سرکش جن بھی ہوسکتے ہیں، جو جادو کی تعلیم دیتے تھے۔

(استفادہ، تفسیر حقانی)

Marfat.com

بحث ثانی: ہاروت اور ماروت کے متعلق مشہور قصہ سراسر جھوٹ ہے

ہاروت ماروت کے متعلق مشہور قصہ اس طرح ہے کہ جب فرشتوں نے انسانوں کے بد اعمال دیکھے تو اللہ رب العزت کے حضور میں عرض کرنے لگے کہ ہمارے پروردگار آپ نے ایک ایسی مخلوق پیدا کی ہے جو آپ کی نافرمانی کرتی ہے تو اللہ رب العزت نے فرمایا جو چیز میں نے ان میں رکھی ہے اگر تمہارے اندر بھی وہ چیز رکھ لوں تو تم بھی انہی کی طرح کر لو گے تو فرشتے کہنے لگے سبحانك لا نعصیك ابداً یعنی ہم تو کبھی بھی آپ کی نافرمانی نہیں کریں گے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم فرشتے چن لو، تو انہوں نے بہت ہی نیکوکار دو فرشتے بنام ہاروت و ماروت چن رکھے اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر نفسانی خواہش رکھی اور انہیں حکم دیا کہ زمین کی طرف چلے جاؤ۔ نیز اللہ تعالیٰ نے انہیں شرک کرنے سے اور قتل وغارت کرنے سے اور شراب پینے سے بھی منع کر دی اور انہیں اسم اعظم کا علم بھی دیا، پس وہ اس اسم اعظم کے ذریعے شام کو آسمان پر چلے جاتے اور صبح کو زمین پر آجاتے۔ پھر ایک دن ایک زہرہ نامی عورت انکے پاس آئی جو کہ بہت ہی خوبصورت تھی، جب انکی نظر اس عورت پر پڑی تو یہ اس پر عاشق ہو گئے اور اپنا دل دے بیٹھے اور اس عورت کو اپنے طرف آمادہ کرنے لگے تو عورت نے انکار کیا اور انہیں کہنے لگی کہ مجھے اپنا شوہر مسخر کرا دو پھر کہا کہ اس کو قتل کر دو تو انہوں نے اس کے شوہر کو قتل کر دیا پھر بھی عورت نے انکار کیا اور مطالبہ کیا کہ تم دونوں شراب پیو اور اس بت کو سجدہ کرو اور مجھے وہ اسم اعظم سکھلا دو جس کے ذریعے تم آسمان تک چلے جاتے ہو تو ان فرشتوں نے اسطرح کر دیا پھر وہ کنجری عورت اس اسم اعظم کے ذریعے آسمان پر چلی گئی اور اللہ تعالیٰ نے اس کی شکل مسخ کر کے تارہ کر دیا اب یہ ہے وہ زہرہ تارہ اور وہ دونوں فرشتے اس اسم اعظم کے ذریعے سے بھی آسمان تک نہ چڑھ سکے تو دونوں حضرت ادریس علیہ السلام کی طرف گئے اور انہیں عند اللہ سفارش کیلئے کہا تو حضرت ادریس علیہ السلام نے ان کی سفارش کی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اختیار دیا کہ دنیا کا عذاب پسند کر لو یا آخرت کا عذاب تو انہوں نے دنیا کا عذاب قبول کر لیا اب وہ بابل

Marfat.com

(بابل شہر کے ایک کنویں) میں اپنے بالوں سے لٹکے ہوئے ہیں اور انہیں لوہے کے چابک سے مارا جاتا ہے یہ سلسلہ قیامت تک باقی رہے گا۔ (حاشیہ ۶ جلالین ص ۱۶)

وضاحت: یہ ہے مشہور قصہ جسے عام آدمی بڑی حیرت سے بیان کرتے ہیں لیکن غور کرنے سے دیکھا جاتا ہے کہ یہ بلکل جھوٹا قصہ ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں کیونکہ یہ فرشتے تھے اور فرشتوں کے متعلق اللہ رب العزت کا فرمان ہے لَایَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ۔ کہ یہ (فرشتے) اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے، انہیں جو حکم دیا جاتا ہے وہ کام کر دیتے ہیں۔ (سورہ تحریم)

اس آیت کی روشنی میں ثابت ہوا کہ ہاروت ماروت نہ تو بتوں کو سجدہ کر سکتے ہیں نہ تو شراب نوشی اور زنا اور قتل کر سکتے ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کو جھوٹا کہنا پڑے گا۔

دوسری بات یہ کہ عقل بھی اس کو رد کرتی ہے کہ کنجری تو اسم اعظم کی بدولت آسمان پر پہنچ کر تارہ بنتی ہے اور اسم اعظم سکھلانے والے نہ آسمان پر پہنچ سکتے ہیں نہ اور کسی طرح اللہ کی ناراضگی سے بچ سکتے ہیں بلکہ وہ عذاب میں پھنس جاتے ہیں، لہٰذا یہ یہودیوں کی سازش ہے۔ انہوں نے بے علم اور عام آدمیوں کے اندر اپنی عیاری اور مکاری کے ذریعے بہت سی غلط باتیں پھیلائی ہیں اور لوگوں کو گمراہ کیا ہے۔ ہمارے سادہ مفسرین کرام نے اپنی سادگی سے بغیر غور و فکر کے ایسے قصوں کو بیان کیا ہے بلکہ رطب و یابس باتوں کو اپنی کتابوں میں درج کر بیٹھے ہیں جس سے عوام الناس کا بہت ہی نقصان ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے محققین مفسرین پر جنہوں نے حق و باطل کے درمیان دلائل سے تمیز کر کے ہم پر احسان کیا، اب کچھ ایسے مفسرین کے بیان کو نقل کرتے ہیں۔

امام رازیؒ یوں رقمطراز ہیں واعلم ان ھذہ الروایۃ فاسدۃ مردودۃ غیر مقبولۃ لانہٗ لیس فی کتاب مایدل علی ذالک بل فیہ مایبطلھا۔

(کبیر ج ۱ ص ۶۵۲ بحوالہ جواہر القرآن ج ۱ ص ۵۵)

جان لو کہ یہ روایت فاسد قابل رد، ناقابل قبول ہے کیونکہ کسی بھی ایسی کتاب

Marfat.com

میں نہیں ہے جو اس کو ثابت کرتی ہو بلکہ اس قصہ میں کچھ ایسی چیزیں ہیں جو باطل ہیں۔

ابو حیان اُندلسی لکھتے ہیں

وھٰذا کلہ لایصح منہ شیءٌ والملائکۃ معصومون لایعصون اللہ ما امرھم ویفعلون مایؤمرون ولایستکبرون عن عبادتہ الخ۔ (البحر المحیط ج ا ص ۳۲۹ مطبع دار الفکر بیروت)

یہ قصہ کچھ بھی درست نہیں اور فرشتے معصوم (گناہوں سے پاک) ہوتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ جو انہیں حکم فرماتے ہیں وہ کر دیتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی سے تکبر نہیں کرتے۔

علامہ سید محمود آلوسی حنفی امام رازی کا مذکورہ بالا قول نقل کر کے عراقی سے نقل فرماتے ہیں۔

ونص شھاب العراقی علیٰ ان من اعتقد فی ھاروت و ماروت انھما ملکان یعذبان علیٰ خطیئتھما مع الزھرۃ فھو کافر باللہِ تعالیٰ العظیم۔ (روح ج ا ص ۳۴۱)

کہ جو شخص ہاروت اور ماروت فرشتوں کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ انہیں زہرہ نامی عورت کے ساتھ گناہ پر عذاب دیا جارہا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ سے کفر کرنے والا ہے۔

اب آتے ہیں آیت کی تفسیر کی طرف:

وَمَا اُنْزِلَ میں ما موصولہ ہے نافیہ نہیں ہے اس کا عطف ماتتلوا پر ہے یعنی یہودیوں نے توراۃ کا پیغام توحید چھوڑ کر شیطانی ٹوٹکوں اور ہاروت ماروت کے جادو کی اتباع اور پیروی شروع کر دی۔

انزال: سے مراد وحی نہیں ہے بلکہ الہام کے ذریعے تعلیم مراد ہے الانزال بمعنی الالھام والتعلیم (معالم التنزیل علی ھوامش الخازن ج ا ص ۸۸ مطبع مصطفیٰ البابی مصر)

ملکین: بعض نے مَلِکَیْنِ بکسر اللام پڑھا ہے اس قراۃ پر وہ فرشتے نہیں بلکہ انسان تھے، بادشاہ تھے، لیکن مشہور روایت بفتح اللام ہے لہٰذا فرشتے ماننا ہوگا۔

Marfat.com

فرشتوں کو انسانوں کی طرف بھیجنے میں کیا حکمت تھی؟

اب دیکھنا یہ ہے کہ فرشتوں کو انسانوں کی طرف بھیجنے میں کیا حکمت تھی؟ تو اس سلسلے میں دیکھا جاتا ہے کہ ایک زمانے میں جادو کا چرچہ اتنا بڑھ گیا کہ اس کے عجیب اثرات کو دیکھ کر لوگوں کو اس کی حقیقت اور انبیاء علیہم السلام کے معجزات کی حقیقت میں اختلاط واشتباہ ہونے لگا، بعض لوگ جادوگروں کو مقدس اور قابل اتباع سمجھنے لگے اور بعض لوگ جادو کو نیک کام سمجھ کر اس کو سیکھنے اور اس پر عمل کرنے لگے۔ اس اشتباہ اور غلطی کو دور کرنے کیلئے یعنی جادو اور معجزات کے درمیان فرق امتیاز کو سمجھنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے دو فرشتے ہاروت اور ماروت کو ارسال کیا تاکہ لوگوں کو جادو کی حقیقت اور اس کے شعبوں سے مطلع کردیں تاکہ اشتباہ جاتا رہے، اور لوگ جادو پر عمل کرنے نیز جادوگروں کے اتباع کرنے سے اجتناب کرسکیں۔ اور جس طرح انبیاء علیہم السلام کی نبوت کو معجزات و دلائل سے ثابت کردیا جاتا ہے اسی طرح ہاروت و ماروت کے فرشتے ہونے پر دلائل قائم کردیے گئے تاکہ ان احکامات وارشادات کی تعمیل و اطاعت ممکن ہو۔

اور یہ کام حضرات انبیاء علیہم السلام سے اس واسطے نہیں لیا گیا کہ اول تو خود ان کا ساحرین سے فصل کرنا مقصود تھا اس حیثیت سے گویا وہ ایک فریق تھے سو حکم علاوہ فریقین کے کوئی ثالث ہونا مناسب تھا، دوسرے اس کام کی تکمیل بدون نقل وحکایت ان اقوال وافعال سحریہ کی عادتاً ہو نہ سکتی اور ہر چند کہ نقل کفر کفر نہ باشد عقلاً ونقلاً مُسلّم ہے لیکن پھر بھی ان حضرات کا مظہر ہدایت ہونا کسی قدر اس کام لینے سے مناسب نہ تھا۔ لہٰذا فرشتے تجویز کیے گئے، کیونکہ کارخانہ تکوین میں جو کہ مشتمل ہے، خیر وشر سب پر ان سے ایسے کام بھی لئے جاتے ہیں جو مجموعہ عالم کے اعتبار سے تو بوجہ ترتب مصالح عامہ خیر ہوں۔ لیکن فی ذاتہ بوجہ لزوم مفسدہ خاص شر ہوں جیسے کسی ظالم کا نشوونما دینا یا کسی موذی جانور کا تربیت کرنا تکوینا محمود ہے اور تشریعاً مذموم بخلاف

Marfat.com

انبیاء علیہم السلام کے کہ ان سے خاص تشریعیات کا کام لیا جاتا ہے جو خصوصاً و عموماً خیر ہی خیر ہیں اور ہر چند کہ یہ نقل وحکایت غرض مذکورہ سے ایک تشریعی کام تھا لیکن تاہم بوجہ احتمال قریب اس امر کے کہ اس میں عمل بالسحر کا سبب نہ ہو جائے جیسا کہ واقع میں ہوا۔ ان حضرات کو سبب بالواسطہ بنانا بھی پسند نہیں کیا گیا البتہ کلیات شرعیہ سے حضرات انبیاء علیہم السلام سے بھی اس مقصود کی تکمیل کر دی گئی۔ چنانچہ وہ قواعد کلیہ بعد تفسیر آیت کے سحر کی علت حرمت کے بیان میں احقر بھی نقل کریگا۔ تفصیل جزئیات بوجہ احتمال فتنہ کے ان کے ذریعہ سے نہیں کی گئی اس کی ایسی مثال ہے جیسے انبیاء علیہم السلام نے یہ بتلایا ہے کہ رشوت لینا حرام ہے اور اس کی حقیقت بھی بتلادی لیکن یہ جزئیات نہیں بتلائے ایک طریقہ رشوت کا یہ ہے کہ صاحب معاملہ سے یوں چال کر کے فلاں بات کہے وعلیٰ ہذا کیونکہ اس سے تو لوگ اور ترکیبیں سیکھ سکتے ہیں یا مثلاً اقسام سحر ہی میں مثال فرض کیجئے کہ قواعد کلیہ سے یہ بتلایا گیا کہ دستِ غیب کا عمل جس میں زیر تکیہ یا جیب میں روپیہ مل جاوے ناجائز ہے لیکن یہ نہیں بتلایا کہ فلاں عمل اس طرح کرنے سے روپے ملنے لگتے ہیں آگے اللہ تعالیٰ صاحبِ حکمت و قدرت ہیں۔ محض تفہیم کیلئے ظناً اتنا لکھ دیا گیا، حاصل یہ کہ انہوں نے بابل میں آکر اپنا کام کرنا شروع کیا کہ سحر کے اصول فروع ظاہر کر کے لوگوں کو اسکے عمل بد کے بچنے کی اور ساحرین سے نفرت و دور رکھنے کی تنبیہ اور تاکید کی جیسے کوئی عالم دیکھے کہ جُہلاء اکثر نادانی سے کفر کے کلمات بک جاتے ہیں اسلئے وہ تقریراً یا تحریراً ان کلمات کو جو اس وقت شائع ہیں جمع کر کے عوام کو مطلع کر دے کہ دیکھو یہ کلمات بچنے کے قابل ہیں ان سے احتیاط رکھنا۔ اب وقتاً فوقتاً مختلف لوگوں کی ان کے پاس آمدورفت شروع ہوئی اور درخواست کرنے لگے کہ ہم کو بھی ان اصول فروع سے مطلع کر دیجئے تاکہ ناواقفی سے کسی اعتقادی یا عملی فساد میں نہ مبتلا ہو جائیں اس وقت انہوں نے احتیاطاً و ارشاداً و اصلاحاً یہ التزام کر لیا کہ قبل از اطلاع ان اصول و فروع کے یہ کہہ دیا کرتے کہ دیکھو حق تعالیٰ کو ہماری اس اطلاع کے ذریعے سے اپنے بندوں کی آزمائش بھی مقصود ہے کہ

Marfat.com

دیکھیں اس پر مطلع ہو کر کون شخص اپنے دین کی اصلاح اور حفاظت کرتا ہے کہ شر سے آگاہ ہو کر اس شر سے بچے اور کون شخص اپنا دین خراب کرتا ہے کہ اس شر سے مطلع ہو کر خود ہی اس شر کو اختیار اور اس پر عمل کرنے لگے جس کا انجام کفر ہے خواہ اعتقاداً ہو یا عملاً۔ سو دیکھو ہم تم کو نصیحت کیے دیتے ہیں کہ اچھی نیت سے اطلاع حاصل کیجیو اور پھر بھی اس نیت پر ثابت رہیو، ایسا نہ کرنا کہ ہم سے تو یہ کہہ کر کہ میں بچنے کی غرض سے مطلع ہونا چاہتا ہوں، دریافت اور تحقیق کر لو پھر اس کی خرابی میں خود ہی مبتلا ہو کر ایمان برباد کر لو اور ظاہر ہے کہ وہ اس سے زیادہ اور کیا خیر خواہی کر سکتے تھے غرض جو کوئی اس طرح ان سے عہد و پیماں کر لیتا وہ اس کے روبرو سب اصول و فروع سحر کے بیان کر دیتے اور کام ہی ان کا یہ تھا اب اگر کوئی عہد شکنی کر کے اپنے ارادہ و اختیار سے فاجر یا کافر بن جانے چنانچہ بعضے اس عہد پر قائم رہے اور اس سحر کو ذریعہ ایذا رسانی خلق کا بنا لیا جو فسق تو یقیناً ہے اور بعضے طریقے اس کے استعمال کے کفر بھی ہیں اس طرح فاجر کافر بن گئے اس ارشادِ اصلاحی اور پھر مخاطب کے خلاف کرنے کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص جامع عالم باعمل کے پاس جاوے کہ مجھ کو فلسفہ قدیمہ یا جدیدہ پڑھا دیجئے تاکہ خود بھی شبہات سے محفوظ رہوں اور مخالفین کو جواب دے سکوں اور اس عالم کو یہ احتمال ہو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ کو دھوکہ دے کر پڑھ لے اور پھر خود ہی خلافِ شرع عقائدِ باطلہ کو تقویت دینے میں اس کو استعمال کرنے لگے اس احتمال کی وجہ سے اس کو نصیحت کرے کہ ایسا مت کرنا اور وہ کر لے اور اسلئے اس کو پڑھا دیا جاوے، لیکن پھر وہ شخص درحقیقت قصداً اسی سوءِ استعمال محتمل میں مبتلا ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اس کی اس حرکت سے اس معلم پر کوئی ملامت یا برائی عائد نہیں ہو سکتی۔ اس طرح اس اطلاعِ سحر سے ان فرشتوں پر بھی نہ کسی شبہ کی گنجائش ہے نہ وسوسہ کی اور اس خدمت کی تکمیل کے بعد غالباً وہ فرشتے آسمان پر بلا لیے گئے ہوں گے۔ (بیان القرآن، سورہ البقرہ آیت ۱۰۲)

Marfat.com

تیسری بحث: کیا حضرت سلیمان علیہ السلام سے نماز میں غفلت ہوئی تھی؟

اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ فَقَالَ اِنِّيْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ ۚ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ رُدُّوْهَا عَلَيَّ ۖ فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ۔

(سورہ ص آیت ۳۱ تا ۳۳)

ترجمہ: جب دیکھانے کو لائے اس کے سامنے شام کو گھوڑے بہت خاصے تو بولا میں نے دوست رکھا مال کی محبت کو اپنے رب کی یاد سے یہاں تک کہ (سورج) چھپ گیا اوٹ میں پھر لاؤ ان کو میرے پاس پھر لگا جھاڑنے ان کی پنڈلیاں اور گردنیں۔

(۱) یہ کیسے ہوا کہ اللہ کا پیغمبر ہو کر حضرت سلیمان مال کی محبت میں آ کر نماز جیسے اہم فریضہ سے غفلت کرنے لگے؟

(۲) نیز ہزاروں کی تعداد میں گھوڑے ذبح کر دیے اس میں گھوڑوں کا کیا قصور تھا؟ اور اس میں تو مال ضائع بھی ہوا یہ کیسے ہوا؟

ان آیات کی تفسیر علماء کرام دو طرح پیش کرتے ہیں۔

(۱) حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک مرتبہ جہاد کیلئے جو گھوڑے تیار کر رکھے تھے ان کیلئے حکم دیا کہ اصطبل سے لائے جائیں۔ گھوڑے پیش ہوئے تو ان کی دیکھ بھال میں ایسے مشغول ہوئے کہ عصر کا وقت جو نماز پڑھنے کا معمول تھا وہ چھوٹ گیا، ہیبت کہ وجہ سے لوگ بھی متوجہ نہ کر سکے، بعد میں جب خود متنبہ ہوئے تو فرمایا کہ مال کی محبت یادِ خدا پر غالب آ گئی اور اس غم و غصہ میں گھوڑوں کو واپس منگایا اور یادِ خدا کی محبت کے جوش میں ان سب کو ذبح کر ڈالا کہ وہی اس غفلت کا باعث بنے تھے۔

اس تفسیر کے اعتبار سے حتیٰ توارت بالحجاب میں توارت کی ضمیر آفتاب کی جانب راجع ہو گی عبارت اس طرح سمجھی جائیگی توارتِ الشمسُ بالحجاب۔

اور طَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ میں مسح کے معنی "ضرب و قطع" کے ہونگے یعنی ان کی کونچیں اور گردنیں کاٹ ڈالیں۔

Marfat.com

اس تفسیر کے اعتبار سے مندرجہ بالا اشکالات کی وضاحت اس طرح ہو گی۔

وضاحت: توجیہ ا: حضرت سلیمان علیہ السلام کی یہ نماز نفلی تھی اور نفلی نماز کا قضا ہو جانا گناہ نہیں تاہم انبیاء علیہم السلام کی شان یہی ہے کہ اس کی بھی تلافی کرنے کی کوشش کرتے ہیں اسلئے تمام گھوڑے قربان کر ڈالے، اور قربانی عبادت ہے۔

توجیہ ۲: اگر مانا جائے کہ وہ نماز یا معمول فرض تھا تو بھی کوئی گناہ نہیں ہے کیونکہ گھوڑوں کے معائنہ میں اتنے مصروف ہوئے کہ بھول طاری ہو گئی۔ تو حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ عمل قصداً نہیں ہوا، جیسا کہ غزوہ خندق مین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عصر کی نماز فوت ہو گئی تھی۔

توجیہ ۳: یہ گھوڑے حضرت سلیمان علیہ السلام کی ذاتی ملکیت میں تھے اور ان کی شریعت میں گائے، بکری، اونٹ کی طرح گھوڑے کی قربانی بھی جائز تھی لہٰذا انہوں نے گھوڑوں کو ضائع نہیں کیا، بلکہ انہیں اللہ تعالیٰ کے نام قربان کر دیا، جس طرح گائے بکری کی قربانی سے انکو ضائع کرنا لازم نہیں آتا، بلکہ یہ عبادت ہی کا ایک شعبہ ہے اور جب یہ گھوڑے بطور عبادت کے ذبح کئے گئے تو اسمیں جانوروں کے قصور کی بات بھی قابل بحث نہیں رہیگی۔

دوسری تفسیر جو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بطریق علی بن ابی طلحہ منقول ہے اس میں نہ نماز فوت ہونے، اور نہ سورج غروب ہونے کا مسئلہ ہے نہ گھوڑوں کے ذبح کر دینے کا واقعہ زیر بحث آیا ہے۔ لہٰذا نہ اشکالات ہوتے ہیں نہ ہی وضاحتوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

اس تفسیر کے اعتبار سے واقعہ کی صورت اس طرح ذکر کی گئی ہے کہ جہاد کی ایک مہم کے موقع پر ایک شام کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے جہاد کے گھوڑوں کو اصطبل سے لانے کا حکم دیا، جب وہ پیش کئے گئے تو آپ کو چونکہ گھوڑوں کی نسلوں اور انکے ذاتی اوصاف کے علم کا کمال حاصل تھا، اس لئے آپ نے جب ان سب کو اصیل، سبک رو، خوش رو، اور بہت بڑی تعداد میں پایا تو آپ پر مُسرت و انبساط کی کیفیت طاری

Marfat.com

ہو گئی اور فرمانے لگے، ان گھوڑوں سے میری یہ محبت ایسی مالی محبت میں شامل ہے جو پروردگار کے ذکر ہی کا ایک شعبہ ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس غور و فکر کے درمیان گھوڑے اصطبل کو روانہ ہو گئے، چنانچہ جب انہوں نے نظر اوپر اٹھائی تو وہ نگاہ سے اوجھل ہو چکے تھے آپ نے حکم دیا ان کو واپس لاؤ۔ جب وہ واپس لائے گئے تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے محبت اور آلات جہاد کی حیثیت سے عزت و توقیر کی خاطر ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنا اور تھپتھپانا شروع کر دیا اور ایک ماہر فن کی طرح ان کو مانوس کرنے لگے

اس تفسیر کی مطابق اِنِّیٓ اَحۡبَبۡتُ حُبَّ الۡخَیۡرِ عَنۡ ذِکۡرِ رَبِّیۡ کا ترجمہ یہ ہوا ''بے شبہ میری محبت مال (جہاد کے گھوڑوں کی محبت) ذکر خدا ہی میں ہے۔'' عَنۡ ذِکۡرِ ربی۔ ای۔ لِاَجَلِ ذِکۡرِ رَبِّیۡ اور تورات بالحجاب میں تورات کی ضمیر صافنات الجیاد ہی کی طرف ہے یعنی جب گھوڑے آنکھ سے اوجھل ہو گئے، اس طرح ''شمس'' کے محذوف ماننے کی ضرورت نہیں رہتی۔ رُدُّوۡھَا عَلَیَّ کا مطلب ہے کہ ان گھوڑوں کو دوبارہ دوڑانے کیلئے لاؤ۔ گھوڑے کی روانی دیکھنے کا طریقہ بھی یہی ہے کہ ایک بار دوڑاتے ہوئے لے جاتے ہیں، بارِ دگر پھر لاتے ہیں تاکہ آنے جانے میں سب حسن و قبح معلوم ہو جاوے۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس طرح دیکھنے سے گھوڑے پسند آئے توفَطَفِقَ مَسۡحًا بِالسُّوۡقِ والاعناقِ۔ یعنی آپ پیار کی راہ سے ان کی ٹانگوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگے، یعنی ''مسح'' اپنے اصلی معنی ''چھونے اور ہاتھ پھیرنے'' میں ہونگے امام رازیؒ اور بعض دوسرے مفسرین نے اس تفسیر کو راجح اور قرین صواب سمجھا ہے۔

اس میں ضمیر کی ترجیع مذکور کی طرف ہو گی اور یہی زیادہ مناسب ہے۔

(استفادہ معارفِ القرآن، تفسیر حقانی، قصص القرآن، تفسیر مظہری)

چوتھی بحث: القیناعلی کرسیہ جسداً کا مطلب

وَلَقَدۡ فَتَنَّا سُلَیۡمٰنَ وَ اَلۡقَیۡنَا عَلٰی کُرۡسِیِّہٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ (سورہ ص آیت ۳۴)

Marfat.com

اور ہم نے سلیمان کو آزمایا تھا اور اس کی کرسی پر ایک دھڑ ڈال دیا تھا پھر اس نے خدا کی طرف رجوع کیا۔

بعض مفسرینِ عظام اس آیت کی تفسیر میں کچھ واقعات کو چسپاں کرتے ہیں جو غورِ طلب ہیں۔

واقعہ ا: بغویؒ نے لکھا ہے کہ محمد بن اسحاق نے وہب بن منبہ کی روایت سے بیان کیا۔ وہب نے کہا حضرت سلیمان علیہ السلام نے سنا کہ سمندر میں کوئی جزیرہ ہے جس کا نام صیدون ہے وہاں کا ایک بڑا بادشاہ ہے جزیرہ کا محل وقوع چونکہ سمندر میں ہے اسلئے کوئی شخص صیدون تک نہیں پہنچتا (اور بادشاہ آزاد ہے کسی کا تابع نہیں) اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو وہ حکومت عطا کی تھی کہ ان کی حکومت سے بحر و بر میں کوئی چیز باہر نہیں تھی آپ ہوا پر سوار ہو کر ہر جگہ پہنچ جاتے تھے یہ اطلاع ملنے کے بعد آپ ہوا پر سوار ہو کر اس شہر کی طرف روانہ ہو گئے اور جن و انس کے لشکر سمیت وہاں پہنچ کر اتر گئے بادشاہ کو قتل کیا اور جزیرہ میں جو کچھ تھا اس پر بطورِ مالِ غنیمت قبضہ کر لیا من جملہ دیگر اشیاء کے آپ کو وہاں بادشاہ کی ایک لڑکی بھی ملی جس کو جرادہ کہا جاتا تھا ایسی حسین و جمیل لڑکی کسی نے نہیں دیکھی آپ نے اپنے لئے اس کا انتخاب کر لیا اول اس کو دعوتِ اسلام دی وہ ناگواری خاطر کے ساتھ مسلمان ہو گئی۔ آپ نے اس سے نکاح کر لیا۔ آپ کو اس سے اتنی زیادہ محبت ہو گئی کہ اور کسی بیوی سے نہیں تھی وہ لڑکی حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس اتنے بڑے مرتبے تک پہنچنے کے بعد بھی ہمیشہ غمگین رہتی تھی اس کے آنسو نہیں رکتے تھے، حضرت سلیمان علیہ السلام کیلئے یہ بات تکلیف دہ تھی آپ نے اس سے فرمایا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ تیرا غم دور نہیں ہوتا اور آنسو نہیں تھمتے کہنے لگی مجھے اپنے باپ کی اس کی حکومت کی اور اس پر جو مصیبت پڑی اس کی یاد آتی ہے جو مجھے غمگین بنائے رکھتی ہے حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا اس کے عوض تو اللہ نے تجھے وہ ملک عطا کر دیا جو اس کے ملک سے بڑا ہے اور ایسی حکومت عنایت کر دی جو اس کی حکومت سے عظیم ہے اور مسلمان ہو جانے کی تجھے توفیق دی جو سب

Marfat.com

سے بہتر (نعمت) ہے۔

وہ کہنے لگی ہاں یہ تو سب کچھ ہے پھر بھی جب مجھے باپ کی یاد آتی ہے تو غم چھا جاتا ہے جو آپ دیکھتے ہی ہیں اگر آپ حکم دیں جنات کو کہ اس مکان کے اندر جس میں میں رہتی ہوں میرے باپ کی مورتی بنادیں اور میں صبح و شام اس کو دیکھتی رہوں تو امید ہے کہ میرا غم دور ہو جائے گا اور میرے دل کو کچھ تسلی ہو گی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنات کو حکم دیا کہ اس کے باپ کی ایک مورت اس کے گھر کے اندر بنادو کوئی فرق نہ ہو۔ جنات نے ایسی مورتی بنادی اس عورت نے دیکھ لیا کہ بعینہ یہ اس کا باپ ہے فقط اتنی بات ہے کہ اس میں جان نہیں ہے پھر اس کو کرتہ پہنایا صافہ باندھا اور چادر اوڑھا دی اور ویسے ہی کپڑے پہنا دیے جو وہ (اپنی زندگی میں) پہنا کرتا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام جب اس کے گھر سے باہر نکل جاتے تو وہ صبح شام اپنی لونڈیوں اور باندیوں کو ساتھ لے کر مورتی کے پاس جاتی اور جیسا باپ کی زندگی میں اس کا دستور تھا اسی کے مطابق مورتی کو خود بھی سجدہ کرتی اور باندیاں اس کے ساتھ سجدہ کرتیں۔ چالیس روز تک حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس کا کوئی علم نہ ہوا۔ آصف بن برخیا کو اس کی اطلاع مل گئی آپ حضرت سلیمان علیہ السلام کے گہرے دوست تھے حضرت سلیمان علیہ السلام کے دروازے آپ کیلئے ہر وقت کھلے رہتے تھے جس وقت چاہتے حضرت سلیمان علیہ السلام کے جس گھر میں چاہتے داخل ہو جاتے کوئی آپ کو لوٹا نہیں سکتا تھا۔ سلیمان علیہ السلام سے انہوں نے کہا اے اللہ کی نبی میں بوڑھا ہو گیا ہڈیاں ضعیف ہو گئیں عمر ختم ہونے کے قریب آگئی جانے کا وقت آگیا اب میں چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے کسی ایک جگہ کھڑا ہو کر اللہ کے پیغمبروں کا تذکرہ کروں اور اپنی معلومات کے مطابق ان کے اوصاف بیان کروں اور انبیاء کے متعلق جو بعض باتیں لوگ نہیں جانتے ہیں ان کو بتاؤں حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا (جیسا چاہو) کرو۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے آصف کی تقریر سننے کیلئے لوگوں کو جمع کر دیا۔ آصف تقریر کرنے کھڑے ہو گئے گذشتہ انبیاء کا ذکر کیا ہر نبی کے خصوصی اوصاف جو اس میں تھے بیان

Marfat.com

کیے اور جو فضیلت اللہ نے اس کو (خاص طور پر) دی تھی وہ ظاہر کی تقریر کرتے کرتے حضرت سلیمان علیہ السلام کے تذکرے پر آئے تو کہا آپ بچپن میں بڑے عقلمند حلیم بڑے پرہیز گار اور بڑے پُر حکمت حکم دینے والے تھے اور چھوٹی عمر میں ہر امر مکروہ سے بہت دور تھے یہ کہہ کر تقریر ختم کر دی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا آصف تم نے گذشتہ انبیاء کا تذکرہ کیا اور ہر عمر کے ان کے اچھے اوصاف بیان کیے لیکن جب میرا تذکرہ کیا تو چھوٹی عمر کے میرے اچھے اوصاف تم نے بیان کیے اور بڑے ہونے کے بعد جو میرے اوصاف تھے ان کی طرف سے خاموشی اختیار کر لی آخر بڑا ہو کر میں نے کون سی نئی بات کر لی حقیقت میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے آصف کی تقریر کو برا محسوس کیا اتنا کہ غصہ سے بھر گئے اور گھر جا کر آصف کو بلوا کر یہ بات کہی۔ آصف نے جواب دیا ایک عورت کی محبت کی وجہ سے آپ کے گھر کے اندر چالیس روز سے صبح کو اللہ کے سوا دوسرے کی پوجا ہو رہی ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا کیا میرے گھر میں؟ آصف نے کہا (ہاں) آپ کے گھر میں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ میں تو جانتا ہی تھا کہ تم نے جو کچھ کہا وہ بے وجہ نہیں تھا یقیناً تم کو کوئی اطلاع ملی ہے پھر آپ اس عورت کے گھر میں گئے بت کو توڑا عورت کو سخت سزا دی اور اپنا لباس اتار کر دوسرے کپڑے پہنے جن کا سوت صرف دوشیزہ (نابالغ معصوم لڑکیوں نے کاتا تھا اور دوشیزہ لڑکیوں نے ہی بُنا تھا کسی بالغہ نے چھوا بھی نہ تھا یہ لباس پہن کر تنہا جنگل کو نکل گئے وہاں چولہے کی راکھ کا بستر بچھوایا پھر توبہ کرنے کیلئے اس خاکی بستر پر بیٹھے اور کپڑوں سمیت اس پر لوٹے اللہ کے سامنے گڑگڑائے اور زاری کی دعا کرتے رہے روتے رہے اور جو کچھ گھر میں ہوا اس کی معافی مانگتے رہے شام تک اسی میں مشغول رہے شام ہو گئی تو گھر واپس آ گئے۔

واقعہ ۲: اس طرح یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک اُمّ ولد تھی جس کو امینہ کہا جاتا تھا آپ جب بیت الخلاء جاتے یا کسی بی بی سے قربت صنفی کرنے کا ارادہ کرتے تو اپنی مُہر (جو انگوٹھی میں تھی) امینہ کے پاس رکھ دیتے تھے اور

Marfat.com

جب تک ضرورت سے فراغت کے بعد بالکل پاک نہ ہوجاتے مُہر کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے تھے اسی مہر سے آپ کی حکومت وابستہ تھی ایک روز امینہ کے پاس مہر رکھ کر بیت الخلاء کو چلے گئے آپ کے جانے کے بعد سمندری شیطان جس کا نام صخر تھا حضرت سلیمان علیہ السلام کی شکل میں امینہ کے پاس آیا اور مہر طلب کی امینہ نے اس کی شکل میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی شکل سے کوئی غیریت (اجنبیت) محسوس نہیں کی اور سلیمان سمجھ کر مہر دیدی صخر نے وہ مہر اپنے ہاتھ میں پہن لی اور باہر جاکر حضرت سلیمان علیہ السلام کے تخت پر بیٹھ گیا اور سارے پرندے، جنات اور انسان اس کے پاس آکر حسب معمول جمع ہوگئے حضرت سلیمان علیہ السلام بیت الخلاء سے نکل کر امینہ کے پاس پہنچے اور کہا امینہ میری انگوٹھی لاؤ۔ چونکہ ہر دیکھنے والے کو آپ کی حالت اور ہیئت بدلی ہوئی دکھائی دیتی اس لئے امینہ بھی نہ پہچان سکی اور بولی تو کون ہے آپ نے فرمایا میں سلیمان بن داؤد ہوں، امینہ نے کہا تو جھوٹا ہے ابھی سلیمان میرے پاس آکر مہر لیکر گئے ہیں اور تخت حکومت پر اس وقت بیٹھے ہوئے ہیں، حضرت سلیمان علیہ السلام سمجھ گئے کہ یہ گناہ کا وبال ہے پھر آپ بنی اسرائیل کے گھروں پر جاتے اور خانہ بخانہ چکر لگاتے اور کہتے میں سلیمان بن داؤد ہوں لیکن لوگ دیوانہ سمجھ کر آپ کے اوپر مٹی ڈالتے اور گالیاں دیتے اور کہتے تھے اس دیوانہ کو دیکھو کیا کہتا ہے! کہتا کہ میں سلیمان ہوں، اپنے آپ کو سلیمان سمجھتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ حالات دیکھے تو سمندر کی طرف چلے گئے اور مچھلی کے ٹھیکداروں کی مچھلیاں اپنے اوپر لاد کر بازار تک پہنچاتے اور صاحب مال آپ کو روزانہ دو مچھلیاں مزدوری میں دے دیتا تھا شام ہوتی تو ایک مچھلی آپ فروخت کر کے روٹیاں لے لیتے اور دوسری مچھلی بھون کر کھالیتے، چالیس روز تک اسی حالت میں رہے، اور چالیس ہی دنوں تک آپ کے گھر کے اندر بت کی پوجا ہوتی رہی۔

آصف اور دوسرے علماء بنی اسرائیل نے دشمن خدا کے احکام کو اس وقت پہلے کے مقابلہ میں کچھ بدلا ہوا محسوس کیا اس لئے آصف نے کہا اے گروہ بنی اسرائیل کیا تم نے بھی ابن داؤد علیہما السلام کے احکام کو کچھ پہلے کے مقابلہ میں بدلا ہوا محسوس کیا ہے؟

Marfat.com

جیسا میں محسوس کر رہا ہوں، علماء نے کہا جی ہاں، آصف نے کہا تم اتنا توقف کرو کہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی بیویوں سے جا کر پوچھ لوں کہ کیا انہوں نے بھی اندرونی حالت میں کچھ تغیر محسوس کیا ہے جسا کہ ہم بیرونی عام حالات میں محسوس کر رہے ہیں چنانچہ آصف عورتوں کے پاس آئے اور ان سے پوچھا کہ کیا تم نے بھی اندرونی حالات میں کچھ تغیر محسوس کیا ہے؟ عورتوں نے جواب دیا بہت زیادہ۔ وہ تو ہم میں سے کسی عورت کو خون (حیض) کی حالت میں بھی نہیں چھوڑتا اور غسل جنابت بھی نہیں کرتا۔ آصف نے کہا انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ بلاشبہ یہ کھلی ہوئی سخت آزمائش اور مصیبت ہے، آصف نے واپس آکر بنی اسرائیل سے کہہ دیا کہ خاص احوال تو عام حالات سے بھی بڑھ چڑھ کر ہیں، چالیس روز گزر گئے تو شیطان مردود اپنی جگہ سے اٹھ کر دریا پر گیا اور دریا میں مُہر پھینک دی جس کو ایک مچھلی نے نگل لیا اور کسی شکاری نے وہ مچھلی پکڑلی۔ ادھر حضرت سلیمان نے دن کے ابتدائی حصہ میں حسب معمول اپنا کام کیا شام ہوئی تو شکاری نے آپ کو ایک معمولی مچھلی اور دوسری وہ مچھلی جس کے پیٹ میں مہر تھی دیدی سرت سلیمان نے دونوں مچھلیاں لے کر آگئے اور معمولی مچھلی کے بدلے میں تو روٹیاں لے لیں اور جس مچھلی کے پیٹ میں مہر تھی اسکو بھوننے کیلئے جیسے اسکا پیٹ چاک کیا تو اندر سے مہر نکلی آپ نے مہر لے کر ہاتھ میں پہن لی اور سجدہ میں گر گئے اس کے بعد پرندے اور جنات آپ کے پاس آکر جمع ہو گئے اور آدمی بھی آپ کی طرف متوجہ ہوئے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام سمجھ گئے کہ یہ جو مصیبت ان پر آئی تھی یہ اسی بات کی پاداش میں تھی جو ان کے گھر کے اندر ہوئی تھی۔

غرض آپ کی حکومت آپ کو واپس مل گئی اور اپنے گناہ سے علی الاعلان توبہ کی اور جنات کو حکم دیا کہ صخر کو پکڑ کر لاؤ شیاطین نے اس کو ڈھونڈھ نکالا اور پکڑ کر حاضر کر دیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے پتھر کی ایک چٹان مین شگاف کر کے صخر کو اس میں بند کر دیا اور اوپر سے ایک اور چٹان رکھ کر لوہے اور زنگ سے اس کو مضبوط بندش کر دی پھر سمندر میں پھینک دینے کا حکم دے دیا۔

Marfat.com

واقعہ ۳: بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ سوچا کہ میں اس شب میں اپنے حرم کے ساتھ ازدواجی فریضہ ادا کروں تو میری ہر ایک بیوی سے لڑکا پیدا ہو گا اور وہ میدان جہاد کا مجاہد بنے گا، مگر اس خیال کے ساتھ "انشاء اللہ" کہنا بھول گئے، اللہ تعالیٰ کو اولوا لعظم پیغمبر کا یہ طرز ناپسند ہوا، اور اس نے حضرت سلیمان کے اس دعوے کو اس طرح غلط ثابت کر دیا کہ تمام ازواج مطہرات میں سے صرف ایک بیوی کو مردہ بچہ پیدا ہوا۔ جس کو کسی خادمہ (یا دایہ) نے ان کے سامنے اس وقت پیش کیا جبکہ وہ تخت پر متمکن تھے، حضرت سلیمان کو تنبّہ ہوا کہ یہ نتیجہ ہے اسی بات کا کہ اللہ کے سپرد کیے اور انشاء اللہ کہے بغیر میں نے اپنی بات کو زوردار بنایا، چنانچہ فوراً ہی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب رجوع کیا۔ مغفرت طلب کی اور دعا مانگی جس کا ذکر قرآنِ عزیز میں بصراحت موجود ہے، اس تفسیر کی دلیل میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں۔

عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال قال سلیمان بن داؤد لاطوفن اللیلۃ علیٰ سبعین امرأۃ تحمل کل امرأۃ فارساً یجاھد فی سبیل اللہ فقال لہ صاحبہ ان شاءاللہ فلم یقل ولم تحمل شیئاً الا واحداً ساقطا احدیٰ شقیہ فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لو قالھا لجاھدوا فی سبیل اللہ۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ایک مرتبہ سلیمان بن داؤد (علیہ السلام) نے فرمایا کہ آج کی رات میں اپنی ستر بیویوں کے پاس جاؤں گا تا کہ ان میں سے ہر ایک بیوی شہ زور لڑکا جنے، جو اللہ کی راہ میں جہاد کرے، (حضرت) سلیمان (علیہ السلام) کے وزیر نے ان سے کہا "انشاءاللہ" مگر حضرت سلیمان نے اس جملہ کو ادا نہ کیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی بیوی بھی حاملہ نہ ہوئی۔ البتہ ایک بیوی کو ناقص بچہ پیدا ہوا۔ جسکا ایک پہلو نہیں تھا، اس کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر حضرت سلیمان "انشاءاللہ" کہہ دیتے تو ہر ایک حرم کے بطن سے مجاہد پیدا ہوتا۔

واقعہ ۴: یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک بیٹا پیدا ہوا تو جنات

Marfat.com

نے کہا اگر یہ بیٹا زندہ رہے گا تو ہم اس جبری فرمانبرداری سے کبھی نجات نہیں پائیں گے لہٰذا ہمارے لیے یہی ایک راستہ ہے کہ یا تو اس کو قتل کر دیں یا اس کو پاگل بنا دیں۔
حضرت سلیمان علیہ السلام کو جنات کی اس بات کی اطلاع مل گئی تو آپ نے جنات کے فریب کے ڈر سے بچہ کو لے جا کر بادل میں چھپا دیا اور اسے غذا پہنچانے کا حکم دے دیا پھر بچہ فوت ہو گیا تو حضرت سلیمان علیہ السلام کے تخت پر رکھا گیا بس یہی ان کی لغزش پر تنبیہ تھی، کہ انہوں نے اللہ رب العزت پر بھروسہ نہیں کیا۔

واقعہ ۵: یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام سخت بیمار ہو گئے تھے، نقاہت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ جب تخت پر لا کر بٹھائے گئے تو گویا ان کا دھڑ بے جان کے بٹھایا گیا۔ عرب ضعیف کے متعلق کہتے ہیں لحم علی وضم وجسد بلا روح یعنی گوشت ہے لکڑی پر اور جثہ ہے روح کے بغیر یعنی انتہائی کمزور ہے۔ اس صورت میں تقدیر عبارت یہ ہو گی۔ (والقینا جسدہ علی کرسیہ) یہ ان کی آزمائش تھی۔ ثم اناب ای رجع الی حال الصحۃ۔ پھر تندرست ہو گئے اور سمجھ گئے کہ دنیا سدا کسی کے پاس نہیں ہوتی۔ ایک دوسری جگہ جانا ہے اسلئے مغفرت کی دعا کی اور پھر سلطنت ابدی کی دعا مانگی۔ ملکا لاینبغی لاحد من بعدی ای ملکا لایمکن ان ینتقل عَنِّی اِلیٰ غَیْرِی کہ وہ سلطنت جو مجھ سے کبھی غیر کی طرف منتقل ہو کر نہ جاوے۔

وضاحت واقعہ ۱ اور ۲: جہاں تک پہلے اور دوسرے واقعہ کا تعلق ہے تو اس کو گرچہ بعض مفسرین نے بیان کیا ہے، لیکن یہ محض یہودیوں کی خرافات ہے، خالص اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے تخت پر شیطان کا آپ ہی کی شکل میں حکمران بن کر بیٹھنا اور حکومت کی قوت انگوٹھی میں ہونا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی بیویوں تک شیطان کی دست اندازی کرنا اور ان کے گھر میں بت پرستی ہونا اور جزیرے میں بادشاہ کی لڑکی کو پسند کرنا، یہ کیسی بدترین اور بے حیائی کی باتیں ہیں جو کہ حضرت سلیمان علیہ السلام پر چسپاں کی جاتی ہیں صد افسوس! یہ تو کسی عام شریف آدمی کو بھی روا نہیں ہوتیں اور ادھر ایک پیغمبر کے متعلق بیان کی جاتی ہیں یہ باتیں شانِ

Marfat.com

نبوت اور عصمت نبوت کے قطعاً موافق نہیں ہیں۔ بہت سے مفسرین نے انکو کذب قرار دیا ہے عمدۃ المتکلمین حضرت مولانا عبدالحق حقانیؒ تفسیر حقانی میں یوں رقمطراز ہیں کہ ”ان خرافات کا کچھ ٹھکانا ہے؟ اگر یوں ہی جن و شیاطین انبیاء علیہم السلام تو کیا اور بھی کسی کی شکل میں ظاہر ہوا کریں تو دنیا کے تمام کاروبار مطعل ہو جاویں اور کچھ بھی کسی کا اعتبار نہ رہے۔ (تفسیر حقانی ج ۴ ص ۱۴۳)

محقق مفسر ابن کثیر اس قصہ کے آخر میں لکھتے ہیں:

وقد رویت ہذہ القصہ مطولة عن جماعة من السلف رضی اللہ عنہم کسعید بن المسیب وزید بن اسلم وجماعة آخرین وکلہا متلقاۃ من قصص اہل الکتاب۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم الصواب (ابن کثیر ج ۴ ص ۴۸ مطبع قدیمی کتب خانہ کراچی)

یعنی یہ لمبا چوڑا قصہ ہمارے سلف کی ایک جماعت سے نقل کیا گیا ہے جیسے حضرت سعید بن مسیب اور زید بن اسلم وغیرہ لیکن یہ سب اہل کتاب کی کہانیوں سے لیا گیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

وضاحت واقعہ ۳: بعض مفسرین نے اس واقعہ کو مذکورہ بالا آیت پر منطبق کیا اور انہوں نے اس کی تائید میں ایک حدیث شریف بھی پیش کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ تنبیہ ”انشاء اللہ“ نہ کہنے کی وجہ سے ہوئی اس تفسیر کو محقق مفسرین قاضی ابوالسعود اور علامہ آلوسی وغیرہ نے اختیار کیا ہے اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے بھی بیان القرآن میں اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ کو بھی آیت کی قطعی تفسیر نہیں کہا جا سکتا۔ اسلئے کوئی علامت نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو زیر بحث آیت کی تفسیر میں ذکر فرمایا ہو۔ امام بخاری نے بھی یہ حدیث کتاب الجہاد، کتاب الانبیاء اور کتاب الایمان والنذور وغیرہ میں متعدد طریقوں سے نقل کی ہے لیکن کتاب التفسیر میں سورہ ص کی تفسیر کے تحت اسے کہیں ذکر نہیں کیا، بلکہ آیت وھب لی ملکا کے تحت ایک دوسری روایت نقل کی ہے اور اس حدیث کا کوئی حوالہ تک نہیں دیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری کے نزدیک

Marfat.com

بھی یہ واقعہ زیر بحث کی تفسیر نہیں ہے، بلکہ جس طرح انبیاء علیہم السلام کے دوسرے متعدد واقعات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے ہیں اسی طرح یہ بھی ایک جداگانہ واقعہ ہے جس کا کسی آیت کی تفسیر ہونا کوئی ضروری نہیں۔ (معارف القرآن، سورہ ص)

حضرت سیوہارویؒ اس کے متعلق یوں لکھتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلیمان علیہ السلام اور ان کی ازواج مطہرات کا واقعہ اس لیے سنایا کہ امت کو یہ موعظت حاصل ہو کہ اپنے کاموں میں اگر خیر و برکت چاہتی ہے تو ارادہ وغیرہ کے اظہار کے وقت "انشاء اللہ" کہنا چاہیے، نیز شاید یہ بھی مقصد ہو کہ وہب بن منبہ جب یہ قصہ سنایا کرتے تھے تو حضرت سلیمان علیہ السلام کی ازواج مطہرات اور باندیوں کی تعداد ایک ہزار بتایا کرتے تھے، اسلئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعہ کی حقیقت کو ظاہر کرنے کیلئے اس تعداد کو ساٹھ یا بعض روایات کے پیش نظر سو تک بتایا، جن میں بعض ازواج مطہرات تھیں اور باقی جاریات (باندیاں) تھیں۔ (قصص القرآن ج ۲)

وضاحت واقعہ ۴: یہ واقعہ بھی اسرائیلی خرافات میں سے ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ کا پیغمبر اپنی امت کو تو یہ سبق دے کہ اپنا تعلق اکیلے اللہ رب العزت کے ساتھ قائم کرو اور خود اللہ تعالیٰ سے غفلت برتے اور مؤثر حقیقی بادل کو سمجھے؟ دوسرے یہ کہ جو سلیمان بفضل اللہ اپنا حکم جنوں سے اپنے زر خرید غلاموں سے بھی زیادہ منواتا تھا، اس کی تو اپنے بیٹے کے تحفظ کیلئے جنوں کو ایک دھمکی ہی کافی تھی۔

بہر حال اس واقعہ کو واقعہ ۱ اور ۲ کی طرح دیکھا جائے۔

وضاحت: واقعہ ۵: حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ اس کے متعلق لکھتے ہیں یہ تفسیر محض قیاسی ہے، قرآن کریم کے الفاظ سے بھی زیادہ مناسبت نہیں رکھتی اور کسی روایت سے بھی اسکا ثبوت نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ زیرِ بحث آیت میں جس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کی یقینی تفصیلات معلوم کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے اور نہ ہم اس کے مکلف ہیں۔ لہٰذا اتنی بات پر ایمان رکھنا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی کوئی

Marfat.com

آزمائش کی تھی جس کے بعد ان میں انابت الی اللہ کا جذبہ پہلے سے زیادہ پیدا ہوا اور اس واقعہ کو ذکر کرنے سے قرآن کریم کا اصل مقصد تمام انسانوں کو اس بات کی دعوت دینا ہے کہ وہ کسی مصیبت یا آزمائش میں مبتلا ہوں تو انہیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرح پہلے سے زیادہ رجوع الیٰ اللہ کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ باقی رہی حضرت سلیمان علیہ السلام کی آزمائش کی تفصیلات، تو ان کو اللہ کے حوالے کرنا چاہئے۔ واللہ اعلم۔

پھر بھی اگر اس آیت کی مطابقت میں کسی واقعہ کی مطابقت تلاش کرتے ہیں تو وہ واقعہ ۳ ہی ہو سکتا ہے، ورنہ ہم آیت کی کسی بھی واقعہ کو چسپاں کرنے کے پابند نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء علیہم السلام پر آزمائشیں آتی ہیں، یہاں پر کون سی آزمائش تھی اسکے جاننے کے ہم پابند نہیں لہٰذا ہمیں حضرات انبیاء علیہم السلام کی طرف ایسی باتیں منسوب کرنا جو کہ ان کے شان میں تنقیص کرتی ہیں اور ان میں بطور عیب کے ظاہر ہوتی ہیں قطعاً جائز نہیں جبکہ انکا کوئی مستند حوالہ بھی نہیں ہے۔

پانچویں بحث: حضرت سلیمان علیہ السلام کا بلقیس کی پنڈلیوں کو دیکھنا

قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّ كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ۬ؕ قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَ اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (سورہ النمل آیت ۴۴)

ملکہ سے کہا گیا کہ محل میں چلئے پھر جب اس نے اس کو دیکھا تو اس کے صحن بلوری کو پانی سمجھی اور اپنی دونوں پنڈلیوں سے کپڑا اٹھا دیا، (سلیمان علیہ السلام) نے کہا یہ تو ایک حوض ہے شیشوں سے پٹا ہوا۔ وہ بولی کہ اے میرے رب میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا تھا اور میں سلیمان کے ساتھ اللہ کے حکم بردار ہوئی جو جہاں کا رب ہے۔ (ترجمہ حقانی)

اس آیت کی تفسیر میں ایک قصہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو بلقیس سے شادی کرنے کا ارادہ ہوا لیکن انہیں بتایا گیا کہ بلقیس کی پنڈلیوں پر بال ہیں

Marfat.com

جیسے بکری کے جسم پر بال ہوتے ہیں۔ لہٰذا حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کی پنڈلیوں کو دیکھنے کے لئے تالاب پر شیشے کا فرش بنوایا اور یہ سوچا کہ جب وہ اس جگہ پہنچے گی تو ضرور اپنا کپڑا اوپر کریگی تو اس وقت میں اسکی ستر دیکھ لونگا، چنانچہ حضرت سلیمان نے دیکھا کہ اسکی پنڈلیوں پر بال ہیں پھر اسکا حل تلاش کیا بالآخر نورہ اور حمام کے ذریعے بالوں کی صفائی کا اہتمام کیا گیا۔

بحث: اس قصہ میں جو باتیں بتائی گئیں ہیں وہ پیغمبر کی شان کے موافق نہیں ہیں یہ تو عیب ہے۔

وضاحت: جہاں تک شیشے کے فرش لگوانے کا تعلق ہے تو یہ بات درست ہے، لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ کب سوچا تھا کہ بلقیس ستر ظاہر کریگی اور میں دیکھوں گا پھر شادی کرونگا وغیرہ اسکی کوئی مستند روایت نہیں ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے قاصد کے ذریعے صریح الفاظ میں توحید کی دعوت دیدی تھی اب شیشے کے فرش کے ذریعہ اُسے شاہانہ رمز میں عقل کے ذریعہ توحید کا سبق سمجھانہ چاہتے تھے، کیونکہ یمن کے لوگوں کو اپنے عقلمند ہونے پر ناز تھا اور ملکہ بلقیس تو اپنے عقل میں بھی ملکہ تھی انہوں نے سورج کی بندگی میں اپنے عقل کا کمال سمجھا تھا اور انوارات الٰہی اور تجلیات ربانی کو آفتاب میں دیکھ کر آفتاب کو ہی اصل سمجھا اس لئے سورج کی بندگی میں لگ گئے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے انہیں اپنے ناقص عقل اور کوتاہ بینی کا احساس جتلانے کے لئے چھوٹی گہرائی والے تالاب پر صاف شفاف شیشے بلور سے فرش لگوا کر خود ایسی جگہ پر بیٹھ گئے کہ بلقیس کو اس شیشے کے فرش پر سے گذرے بغیر حضرت سلیمان علیہ السلام تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ پس جب وہ آئی تو اس نے بلور کی چمک دمک سے شیشہ محسوس ہی نہیں کیا بلکہ تالاب سمجھ کر اپنی پنڈلیوں سے کپڑا اوپر کیا تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ پانی نہیں ہے بلکہ شیشہ ہے، پانی تو شیشے سے نظر آرہا ہے تو اُسے اپنے ناقص عقل کا احساس ہوا اور خوب سمجھا کہ ہم نے عقل کے ذریعہ سورج کی روشنی دیکھ کر سورج کو ہی معبود سمجھا ہے تو یہ

Marfat.com

ہمارے عقل کی کوتاہی ہے یہ تو تجلیات الٰہی کا مظہر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات تو وراءُ الوراء ہے ہمیں مظہر کو مُظہِر کی حیثیت سے دیکھنا نہیں چاہئے۔ اُسے شیشے اور پانی سے تجلیات کا مسئلہ خوب سمجھ میں آگیا تو فوراً اپنے شرک اور کفر پر ندامت کا اظہار کرتے ہوئے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا رب انی ظلمت نفسی۔ الخ باقی حضرت سلیمان علیہ السلام سے شادی ہوئی یا نہیں اس کے متعلق کوئی مستند روایت نہیں ہے۔

حضرت شیخ قدس سرہ (حضرت مولانا شیخ التفسیر حسین علی رحمۃ اللہ علیہ) نے فرمایا (بلقیس نے کہا) میں نے جس طرح یہاں غلطی کھائی کہ شیشے کے فرش کو پانی سمجھ لیا اسی طرح سورج کی پرستش میں بھی غلطی پر تھی، اور بعض روایتوں میں ہے کہ جنوں کو خطرہ لاحق ہو گیا کہ کہیں حضرت سلیمان علیہ السلام بلقیس سے شادی نہ کرلیں اس لئے انہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس سے متنفر کرنے کے لئے کہا کہ بلقیس کے پاؤں نہایت بھدے ہیں اور اس کی پنڈلیوں پر بال ہیں اس لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے مذکورہ محل بنوایا تاکہ جب وہ پنڈلیوں سے کپڑا اوپر کرے تو وہ اس کے پنڈلیاں اور پاؤں دیکھ سکیں، یہ سراسر غلط اور بے اصل روایت ہے اور عصمت انبیاء علیہم السلام کے منافی ہے۔ (استفادہ، سہل البیان، جواہر القرآن)

چھٹی بحث: حضرت سلیمان علیہ السلام کا اقتدار کی طلب کرنا

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَهَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ

(سورہ ص آیت ۳۵)

حضرت سلیمان نے عرض کیا اے میرے پروردگار مجھ کو معاف کر اور بخش مجھ کو وہ بادشاہی کہ مناسب نہ ہو کسی کو میرے پیچھے۔ بیشک تو ہے سب کچھ بخشنے والا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو حب جاہ اور اقتدار کی خواہش تھی حالانکہ عام آدمی کیلئے بھی حب جاہ اور اقتدار کی طلب کرنا قابل مذمت ہے۔ نیز حضرت سلیمان علیہ السلام کا "لا ینبغی لاحد من بعدی" کہنا دلالت کرتا ہے کہ حضرت

Marfat.com

سلیمان علیہ السلام کو حسد بھی تھا کہ کہیں ایسا اقتدار کسی دوسرے کو نہ مل جائے۔

وضاحت: توجیہ ۱: حضرت سلیمان علیہ السلام نبی ہونے کے ساتھ بادشاہ بھی تھے اسلئے سلطنت میں بھی اعجازی سلطنت کے طالب ہوئے، اسلئے کہ وہ اس زمانے کا مزاج تھا کہ اس وقت کے لوگ شان وشوکت، سلطنتی قوت کو ماننے والے تھے، حشمت وجلال کے سامنے جھکنے کا مزاج رکھتے تھے اور ہر زمانہ کا معجزہ وقتی حالات کی مناسبت سے ہوا کرتا ہے، اسلئے اللہ تعالیٰ نے ان کا تفوّق اسی حیثیت سے ظاہر فرمایا، پھر دیندار ہونے کی وجہ سے انہوں نے اس تفوق کو دین کی بالادستی کا ذریعہ بنایا۔

(استفادہ شرح کمالین سورہ ص)

توجیہ ۲: حضرات انبیاء علیہم السلام کی کوئی دعا اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر نہیں ہوتی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ دعا بھی باری تعالیٰ کی اجازت ہی سے مانگی تھی اور چونکہ اس کا منشاء محض طلب اقتدار نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کے احکام کو نافذ کرنے اور کلمہ حق کو سربلند کرنے کا جذبہ کار فرما تھا، اور باری تعالیٰ کو معلوم تھا کہ حکومت ملنے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام انہی مقاصد عالیہ کیلئے کام کریں گے اور حُبّ جاہ کے جذبات ان کے دل میں جگہ نہیں پائیں گے، اسلئے انہیں اس دعا کی اجازت بھی دے دی گئی اور اسے قبول بھی کر لیا گیا، لیکن عام لوگوں کیلئے از خود اقتدار کے طلب کرنے کو حدیث میں اسلئے منع کیا گیا ہے کہ اس میں حُبّ جاہ ومال کے جذبات شامل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جہاں انسان کو اس قسم کے جذبات نفسانی سے خالی ہونے کا یقین ہو اور وہ واقعتاً اعلاءِ کلمۃ الحق کے سوا کسی اور مقصد سے اقتدار حاصل کرنا نہیں چاہتا ہو تو اسکے لئے حکومت کی دعا مانگنا جائز ہے۔

وَقَالَ الجبائی اَنَّهٗ علیه السلام طَلَبَ مُلْكًا لَایَكُوْنُ لِغَیْرِهٖ وَلَمْ یَطْلُبْ ذَالِكَ اِلاَّ بَعْدَ الِاذْنِ فَاِنَّ الْاَنْبِیَاءَ علیہم السلام لَایَطْلُبُوْنَ اِلاَّ مَا یُؤْذَنُ لَهُمْ فِیْ طَلَبِهٖ وَجَائِزٌ اَنْ یَكُوْنَ اللّٰهُ تَعَالٰی قَدْ اَعْلَمَهٗ اَنَّهٗ اِنْ سَاَلَ ذَالِكَ كَانَ اَصْلَحَ لَهٗ فِی الدِّیْنِ وَاَعْلَمَهٗ اَنْ لَّاصَلَاحَ لِغَیْرِهٖ فِیْهِ۔

(روح المعانی ج ۱۲ ص ۲۰۱ مطبع امدادیہ ملتان)

Marfat.com

علامہ جبائی فرماتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایسی سلطنت مانگی جو اور کسی کو نہ ملے تو ان کی یہ طلب اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بعد ہے، چونکہ انبیاء علیہم السلام وہی طلب کرتے ہیں جس کی انہیں اجازت دی جاتی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ رب العزت نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو معلوم کروایا ہو کہ آپ کا ایسا سوال کرنا آپ کے لئے دین میں درست ہے اور دوسرے کے لئے نہیں ہے۔

ساتویں بحث: چیونٹی کا حضرت سلیمان اور انکے لشکر سے ڈرنا

حَتّٰۤی اِذَاۤ اَتَوۡا عَلٰی وَادِ النَّمۡلِ ۙ قَالَتۡ نَمۡلَۃٌ یّٰۤاَیُّهَا النَّمۡلُ ادۡخُلُوۡا مَسٰكِنَكُمۡ ۚ لَا یَحۡطِمَنَّكُمۡ سُلَیۡمٰنُ وَ جُنُوۡدُهٗ ۙ وَ هُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ۔ (سورۃ نمل آیت ۱۸)

چیونٹی نے کہا اے چیونٹیو اپنے اپنے بلوں میں گھس جاؤ تم کو سلیمان اور ان کی فوجیں کہیں پیس نہ ڈالیں، ایسی حالت میں کہ ان کو پتہ بھی نہ ہو۔

ویسے تو حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے تمام لشکروں کے ساتھ تخت پر نکلتے تھے جو تخت ہوا پر رواں ہوتا تھا، پھر چیونٹی کا پیس ڈالنے کا جملہ کیسے ہوا؟

وضاحت: ممکن ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کی کچھ پیادہ اور سوار فوج زمین پر چل رہی ہو۔ جس کی طرف سے چیونٹی کو اندیشہ ہوا ہو وھم لایشعرون سے ثابت ہوتا ہے کہ چیونٹی کو یقین تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی طرف سے جان بوجھ کر روندنا بلکل نہ ہو گا۔ (استفادہ مظہری)

آٹھویں بحث: حضرت سلیمان علیہ السلام کا انتقال

فَلَمَّا قَضَیۡنَا عَلَیۡهِ الۡمَوۡتَ مَا دَلَّهُمۡ عَلٰی مَوۡتِهٖۤ اِلَّا دَآبَّۃُ الۡاَرۡضِ تَاۡكُلُ مِنۡسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَیَّنَتِ الۡجِنُّ اَنۡ لَّوۡ كَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ الۡغَیۡبَ مَا لَبِثُوۡا فِی الۡعَذَابِ الۡمُهِیۡنِ۔
(سورہ سبا آیت ۱۴)

پھر جب مقرر کیا ہم نے اس پر موت کو نہ جتلایا ان کو اُس کا مرنا مگر کیڑے نے گھن کے کھاتا رہا اُس کا عصا پھر جب وہ گر پڑا معلوم کیا جنوں نے کہ اگر خبر

Marfat.com

رکھتے ہوتے غیب کی نہ رہتے ذلت کی تکلیف میں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو اپنی وفات کے آ پہنچنے کا علم ہوا تو جنات کو بیت المقدس کی باقی تعمیرات کی ہدایت دے کر ایک شیش کمرہ میں دروازہ بند کر کے اس شان سے مصروف عبادت ہو گئے کہ عصاء پر دونوں ہاتھ اور ہاتھوں پر ٹھوڑی رکھے ہوئے کرسی پر تشریف فرما ہیں اور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں گویا نگرانی میں مشغول بھی ہیں۔ اس حالت میں آپ کی روح قبض ہو گئی، مگر عرصہ تک کسی کو احساس نہ ہو سکا اور نعش لکڑی کے سہارے بدستور رہی یہاں تک کہ تعمیر مکمل ہو گئی اور گھن نے لکڑی کو چاٹ کھایا اور جب سہارا نہ رہا تو نعش گر پڑی تب لوگوں کو وفات کا پتہ چلا۔ مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ پھر دیمک کا لکڑی کو کھانے کا اندازہ لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے انتقال کو ایک سال گذر چکا تھا۔

بحث: اس سے اشکال پیدا ہوتا ہے کہ سال بھر کی لمبی مدت تک حضرت سلیمان علیہ السلام کا انسانی تقاضہ (کھانا، پینا اور بیت الخلاء وغیرہ) سے بند رہنے سے کسی کا اس طرف دھیان نہیں گیا، اور کسی کو علم نہ ہو تو کم از کم اہل خانہ، گھر والے تو ضرور معلومات کرتے، یہ کیسے ہوا کہ گھر والے بھی غافل رہے!

وضاحت: حضرت سلیمان علیہ السلام کا اس طرح لمبی مدت تک عبادت اور ریاضت میں مصروف ہونا وقتاً فوقتاً ان کے معمول میں تھا۔

کان سلیمان علیه الصلوٰة والسلام یتحنّث فی بیت المقدس السنة والسنتین والشهر والشهرین واقل من ذالك واکثر فیدخل فیه ومعه طعامه وشرابه فادخله فی المرة التی توفی فیها۔ (ابن کثیر ج۳ ص ۶۹۳۔ سورہ سبا)

یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام ایک سال یا دو سال کبھی ایک مہینہ یا دو مہینہ کبھی اس سے کم یا زیادہ مدت کیلئے بیت المقدس میں عبادت کیلئے بیٹھ جاتے تھے اور اپنے ساتھ کھانا پینا ساتھ لے کر چلے جاتے تھے پس اس انتقال والی مرتبہ میں بھی اس طرح رہتے ہوئے اپنے آپ کو داخل کیا۔

Marfat.com

حقیقت یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نبی ہونے کے ساتھ بادشاہ بھی تھے، شاہانہ رعب ہونے کی وجہ سے کسی کو قریب آنے کی ہمت نہ ہوتی تھی، خصوصاجب کہ متعلقین کو معلوم تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اس طرح عبادت میں مصروف ہوتے ہیں تو لوگ سمجھتے ہونگی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے مخصوص کمرہ میں ضرورت کے وقت اپنی تقاضہ پوری کرتے ہونگے، کام پر لگے ہوئے لوگوں اور جنوں کی باری باری ہوگی صبح والے سمجھتے ہوں گے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے شام کو تقاضہ پوری کی ہوگی اور شام والے سمجھتے ہوں گے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے صبح کو تقاضہ پوری کر چکے ہونگے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

Marfat.com

کیا حضرت عُزیر علیہ السلام کو حیات بعد ممات کا یقین نہیں تھا؟

اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ۭ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۭ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ۭ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔

(سورۃ البقرہ آیت ۲۵۹)

ترجمہ: یا اُس شخص کی طرح جو گذرا ایک شہر پر اور وہ گر پڑا تھا اپنی چھتوں پر بولا کیسے زندہ کریگا اس کو اللہ مر جانے کے بعد پھر مردہ رکھا اُس شخص کو اللہ نے سو برس پھر اُٹھایا یا اُسکو کہا تو کتنی دیر یہاں رہا بولا میں رہا ایک دن یا ایک دن سے کچھ کم کہا نہیں بلکہ تو رہا سو برس اب دیکھ اپنا کھانا اور پینا سڑ نہیں گیا اور دیکھ اپنے گدھے کو اور ہم نے تجھ کو نمونہ بنانا چاہا لوگوں کے واسطے اور دیکھ ہڈیوں کی طرف کہ ہم ان کو کس طرح اُبھار کر جوڑ دیتے ہیں پھر اُن پر پہناتے ہیں گوشت پھر جب اُسپر ظاہر ہوا یہ حال تو کہہ اُٹھا کہ مجھ کو معلوم ہے کہ بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

بحث: کیا حضرت عزیر کو حیات بعد ممات کا یقین نہیں تھا؟

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عزیر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو لوگوں کی

Marfat.com

حیات بعد ممات کا یقین نہیں تھا؟ اور یہ عقیدہ، نبوت کے منصب کے خلاف ہے۔

وضاحت: پہلی بات یہ کہ ان آیات میں مذکور واقعہ کا تعلق کس شخصیت سے ہے؟

اس کے متعلق بعض حضرات کہتے ہیں یہ پیغمبر حضرت یرمیاہ علیہ السلام ہیں لیکن اکثر مفسرین عظام حضرت عزیر علیہ السلام کا نام بیان کرتے ہیں۔

رہی بات احیاء اموات کے متعلق سوالات کی۔ تو انبیاء علیہم السلام کا اس طرح استفسار کرنا ازروئے شک کے ہرگز نہیں ہے، بلکہ وہ علم الیقین کے ساتھ عین الیقین اور حق الیقین کے درجہ تک اور اطمینان کے اعلیٰ مقام تک پہنچنا چاہتے ہیں کیونکہ مخلوق خدا کی رشد وہدایت پر معمور ہونے کی وجہ سے جن ذمہ داریوں کے حامل ہیں، ان کی تبلیغ و دعوت کو بأحسن وجوہ انجام دے سکیں اور یقین کا کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ ایسا باقی نہ رہے جو ان کو حاصل نہ ہو۔

اس سلسلہ میں مزید وضاحت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق جو بیان کر چکے ہیں وہ دیکھیں۔ (استفادہ: قصص القرآن)

Marfat.com

ابحاث حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق

وَ ذَاالنُّوْنِ اِذْ ذَّھَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْهِ فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ۔ (سورۃ الانبیاء آیت ۸۷)

ترجمہ: اور مچھلی والے کا (تذکرہ کیجئے) جب چلا گیا غصہ ہو کر پھر سمجھا کہ ہم نہیں پکڑ سکیں گے اس کو پھر پکارا ان اندھیروں میں کہ کوئی حاکم نہیں سوائے تیرے تو بے عیب ہے میں تھا قصور والوں میں سے۔

اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ (سورہ صافات آیت ۱۴۰)

جب بھاگ آیا بھری ہوئی کشتی کی طرف۔

ان آیات سے قابل بحث یہ باتیں ہیں۔

بحث اول: اِذْ ذَّھَبَ مُغَاضِبًا یعنی اللہ رب العزت پر غصہ ہو کر چل دیئے جبکہ عام آدمی بھی اللہ پر غصہ نہیں کر سکتا، تو ایک نبی کیسے اللہ تعالیٰ پر غصہ کر سکتا ہے؟

بحث ثانی: اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر یقین نہیں تھا وہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ مجھے نہ پکڑ سکیں گے کیا پیغمبر ایسی فکر رکھ سکتا ہے؟

بحث ثالث: اس عمل کے یعنی چلے جانے کے بعد جب انہیں تکلیف پہنچی تو خود ہی اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہیں، ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی گناہ سے معصوم نہیں ہوتا۔

Marfat.com

بحث اول: اذ ذھب مُغاضبًا

سب سے پہلے ضروری ہے کہ حضرت یونس علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق اس قصہ پر نظر کی جائے جس کو تمام مفسرین عظام نے تھوڑی کمی بیشی سے ذکر کیا ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام عراق کے موصل شہر کی ایک بستی جس کا نام نینویٰ تھا اس کے باشندوں کی طرف بھیجے گئے تھے، آپ نے ان کو ایمان و عمل صالح کی دعوت دی، انہوں نے تمرد اور سرکشی اختیار کی، بالآخر حضرت یونس علیہ السلام ان سے ناراض ہو کر بستی سے نکل گئے، اور ان کو کہہ دیا کہ تین دن کے اندر تمہارے اوپر عذاب آجائیگا، حضرت کے جانے بعد لوگوں کو فکر ہوئی کہ عذاب آہی جائے گا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے عذاب کے کچھ آثار بھی دیکھے تو انہوں نے حکمرانوں سمیت سب نے شرک و کفر سے توبہ کی اور بستی کے سب افراد مرد اور عورتیں اور بچے سب شہر چھوڑ کر جنگل کی طرف نکل آئے اور اپنے مویشی، جانوروں کو بھی ساتھ لائے اور ان کے بچوں کو ان سے جدا کر کے گریہ وزاری شروع کی اور اللہ جل شانہ سے پناہ مانگنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی عاجزی اور سچی توبہ، الحاح وزاری کو قبول کیا اور عذاب کو ان سے ہٹا دیا۔

ادھر حضرت یونس علیہ السلام کو جب معلوم ہوا کہ عذاب نہیں آیا اور قوم اپنی جگہ صحیح وسالم ہے تو ان کو یہ فکر ہوئی کہ اب میں جھوٹا سمجھا جاؤں گا، بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ ان کی قوم کا یہ رواج تھا کہ کسی کا جھوٹا ہونا ثابت ہو جاتا تو اسے قتل کر دیتے تھے تو حضرت یونس علیہ السلام کو اپنی جان کا بھی خطرہ لاحق ہو گیا۔ حضرت یونس علیہ السلام نے اپنی قوم میں واپس جانے سے بہتر سمجھا کہ کسی دوسری جگہ ہجرت کر کے چلا جاؤں اس ارادے سے سفر شروع کیا راستہ میں دریا تھا اس کو پار کرنے کیلئے ایک کشتی میں سوار ہوئے، جو اور لوگوں کو لے کر جا رہی تھی اتفاق سے کشتی ایسے گرداب میں پھنسی کہ غرق ہونے کا خطرہ لاحق ہو گیا، کشتی میں طے ہوا کہ وزن کو ہلکا کیا جائے، لہٰذا کسی ایک

Marfat.com

کو دریا میں ڈال دیا جائے تاکہ کشتی غرقابی سے بچ جائے۔ اسلئے انہوں نے قرعہ اندازی کی اتفاق سے قرعہ حضرت یونس علیہ السلام کے نام پر نکل آیا کشتی والوں نے ایک صالح صورت دیکھ کر ان کو دریا کے حوالے کرنا مناسب نہ سمجھا، دوبارہ قرعہ ڈالا پھر بھی حضرت یونس کا نام نکل آیا پھر تیسری مرتبہ قرعہ ڈالا پھر بھی حضرت یونس علیہ السلام کا نام نکلا تو حضرت یونس علیہ السلام نے دریا میں چھلانگ لگادی، ادھر ایک بڑی مچھلی کو حکم ہوا جس نے حضرت یونس علیہ السلام کو نگل لیا۔ اس مچھلی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بھی ہدایت تھی کہ یونس علیہ السلام تیری غذا نہیں، لہٰذا اس کے گوشت پوست اور ہڈی وغیرہ کو کوئی نقصان نہ پہنچے وہ تیرے پیٹ میں چند دن امانت ہیں۔

وضاحت: اس قصہ سے اور قرآن کریم کی عبارت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت یونس علیہ السلام نے اللہ رب العزت کے حکم کی صریح نافرمانی کی۔ البتہ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہجرت کا صریح حکم ملے بغیر اپنے اجتہاد سے ہجرت کو ضروری سمجھ کر روانہ ہوئے تو یہ بات اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہوئی اور عتاب نازل ہوا۔ حضرت یونس علیہ السلام نے جو قوم کو تین دن کے اندر عذاب آجانے سے ڈرایا تھا تو ظاہر ہے کہ یہ اپنی رائے سے نہیں بلکہ وحی الٰہی سے ڈرایا تھا اور ایسے اوقات میں قوم کو چھوڑ کر الگ ہو جانا انبیاء علیہم السلام کی عادت تھی اس لئے صریح حکم کا انتظار نہ کیا، نیز قوم میں واپس جانے سے یہ خطرہ کہ اب میں جھوٹا سمجھا جاؤں گا اور میری دعوتِ توحید بے اثر اور بے فائدہ ہو جائے گی اس کو بھی جھوٹ سمجھا جائے گا اور میری اپنی جان بھی خطرہ میں ہوگی، لہٰذا بہتر ہے کہ ہجرت کر کے چلا جاؤں تو میرا یہ عمل عند اللہ قابل مؤاخذہ و قابل گرفت نہیں ہوگا۔ یہی مطلب ہے فظن ان لن نقدر علیہ کا۔ حضرت یونس علیہ السلام کا یہ فیصلہ گناہ نہیں تھا، لیکن ہجرت کے صریح حکم کا انتظار نہ کرنا خلاف اولیٰ ضرور تھا۔ انبیاء علیہم السلام اور مُقربّانِ بارگاہِ الٰہی کی شان بہت بلند ہوتی ہے ان سے اس معاملے میں ادنیٰ درجہ کی لغزش ہوتی ہے تو اس پر عذاب اور گرفت ہوتی ہے لہٰذا یہ عتاب بھی اسی اعتبار سے ہے۔

Marfat.com

حضرات مفسرین فرماتے ہیں کہ حضرت یونس علیہ السلام کا مچھلی کے پیٹ میں چند روز رہنا تعذیب کے طور پر نہ تھا، بلکہ تادیب کے طور پر تھا جیسے اپنے بچوں پر زجر و تنبیہ تعذیب نہیں ہوا کرتی بلکہ تادیب ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کی اس نامناسب حالت کو سخت تعبیر سے ظاہر فرمانے کے ساتھ فرمایا وَاِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ اور فرمایا فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ان الفاظ سے حضرت یونس علیہ السلام کی عظمت، شان اور رفعت مرتبہ کو محفوظ رکھا تاکہ کسی کو مغالطہ نہ ہونے پائے اور انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اس خاص معاملہ سے کسی کج فہم کو کجروی کا موقعہ ہاتھ نہ آئے۔

اب آتے ہیں الفاظ کی وضاحت کی طرف

وضاحت ۱: ذَهَبَ مُغَاضِبًا۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے یعنی جب یونس علیہ السلام نے یہ دیکھا کہ عذاب کی مدت پر عذاب نہیں آیا تو اس بات پر خفا ہو کر چلے گئے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو قوم کے سامنے جھوٹا بنا دیا، لیکن یہ معنیٰ ہرگز صحیح نہیں اسلئے کہ جب یہ بات سب کے نزدیک تسلیم شدہ ہے کہ یونس علیہ السلام اپنی قوم سے ناراض ہو کر اور عذاب کی پیشگوئی کر کے نینوا سے چلے گئے تھے تو پھر اس صاف معنیٰ کو چھوڑ کر ایک بے سند قصہ کو اس میں اس طرح اضافہ کرنا کہ وہ نینوا کی بستی سے نکل کر کچھ دن جنگل میں مقیم رہے تاکہ قوم کی ہلاکت کا حال معلوم کریں۔ اور جب شیطان نے پیر ضعیف کی شکل میں آکر عذاب ٹل جانے کی اطلاع دی تو اللہ تعالیٰ سے خفا ہو کر چل دیئے اور پھر کشتی کا واقعہ پیش آیا یہ قطعاً غلط ہے ایک پیغمبر ایسا عمل نہیں کر سکتا۔

وضاحت ۲: ذَهَبَ مُغَاضِبًا اس سے مراد ہے کہ اپنی قوم پر غصہ ہو کر چلے گئے۔

فَحَمَلَهٗ عَلٰى اَنَّهٗ لِقَوْمِهٖ (تفسیر خازن) ص ۲۹۳)

یعنی اس مُغَاضِبًا کا محمل ان کی قوم ہے مُغَاضِبَتُهٗ لِقَوْمِهٖ اَنَّهٗ اَغْضَبَهُمْ بِمُفَارَقَتِهٖ

(مدارک علیٰ ہوامش خازن ص ۲۹۲)

Marfat.com

یعنی حضرت یونس علیہ السلام کو ان کی قوم نے ناراض کیا، غضبناک کیا یہاں تک ان کو اپنی قوم سے جدائگی کرنی پڑی۔

اَیْ غَضْبَانَ عَلٰی قَوْمِہٖ لِشِدَّۃِ شَکِیْمَتِہِمْ وَتَمَادِیْ اِصْرَارِہِمْ مَعَ طُوْلِ دَعْوَتِہٖ اِیَّاھُمْ وَکَانَ ذَھَابُہٗ ھٰذَا ھِجْرَۃً عَنْھُمْ لٰکِنَّہٗ لَمْ یُؤْمَرْ بِہٖ (روح المعانی ج ۱۷ ص ۸۳ بحوالہ جواہر القرآن)

یعنی اپنی قوم کی سخت مخالفت اور سرکشی پر ڈٹے رہنے کی وجہ سے باوجودیکہ لمبے عرصے تک انکو دین کی دعوت دی، ناراض ہو کر چلے گئے۔ حالانکہ ان کو اس ہجرت کا من جانب اللہ حکم نہیں ہوا تھا۔

واضح مفہوم یہی ہے کہ مُغَاضِبًا کا تعلق قوم سے ہے یعنی حضرت یونس علیہ السلام قوم پر غصہ ہو کر چلے گئے کیا مجال ہے انسان کی کہ باری تعالیٰ قدس شانہ جل و علیٰ پر غصہ ہو!!

وضاحت ۳: ذَھَبَ مُغَاضِبًا اَیْ مُغَاضِبًا لِرَبِّہٖ۔ یعنی اپنے رب، اللہ تعالیٰ کیلئے کفار سے غصہ ہو کر چلدیئے، کفار و فجار سے اللہ تعالیٰ کیے لئے غصہ کرنا عین علامت ایمان ہے۔ اسی اعتبار سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو دیکھا جائے مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ وَاَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ۔ (استفادہ، خازن، ابن کثیر، مظہری، کمالین، جواہر القرآن، قصص القرآن)

دوسری بحث: کیا حضرت یونس علیہ السلام اللہ تعالیٰ کو مؤاخذہ پر قادر نہیں سمجھتے تھے؟

اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْہِ

وضاحت: نقدر کے لفظ میں لغت کے اعتبار سے تین احتمال ہیں ایک احتمال یہ ہے کہ یہ مشتق ہو قُدْرَۃٌ سے جس کے معنی ہیں طاقت۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ لفظ مشتق ہو قَدْرٌ سے جس کے معنی ہیں تنگی کرنا۔ تیسرا احتمال یہ ہے کہ مشتق ہو تقدیرٌ سے جس کے معنی قضاء اور فیصلہ کے ہیں۔

پہلی لغت کے اعتبار سے ان لن نقدر علیہ کی معنی ہونگے کہ حضرت یونس علیہ السلام

Marfat.com

نے یہ گمان کر لیا کہ ہم (اللہ عزوجل) اُن پر طاقت وقدرت نہیں رکھ سکتے، ان پر قابو نہ پا سکیں گے۔

بعض لوگوں نے یہی معنی و مفہوم لیا ہے، لیکن یہ قطعاً غلط ہے، کیونکہ اللہ عزوجل کو غیر قادر ماننا، قدرت ربی کا انکار کرنا صریح کفر ہے۔ ایسا گمان تو عام مسلمان آدمی بھی نہیں کر سکتا چہ جائیکہ وقت کا پیغمبر ایسا گمان کرے!؟ پھر منصب نبوت چہ معنی دارد۔ لہٰذا یہ معنی بلکل غلط ہے البتہ دوسرے اور تیسرے احتمال کے معنی مراد ہو سکتے ہیں۔لَنْ نَقْدِرَ عَلَيْهِ اى لَنْ نُضِيْقَ عَلَيْهِ فِيْ بَطْنِ الْحُوتِ، يُرْوٰى نَحْوُهٰذا عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ ومُجَاهِدٍ والضَّحَاكِ، وَغَيْرِهِمْ وَاخْتَارَهٗ اِبْنُ جَرِيْرٍ واسْتَشْهَدَ عَلَيْهِ بِقَولِهٖ تعالیٰ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا اٰتَاهُ اللهُ۔

یعنی حضرت یونس علیہ السلام نے اپنے اجتہاد سے یہ گمان رکھا کہ ان حالات میں ان کا اپنی قوم کو چھوڑ کر چلے جانے سے ہم ان پر تنگی نہیں کرینگے۔ یہ تفسیر ابن عباس اور مجاہد اور ضحاک وغیر ھم سے نقل کی گئی ہے اور اسی کو ابن جریر نے اختیار کیا ہے اور اس کے دلیل میں یہ آیت ذکر کی ہے

وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا اٰتَاهُ اللهُ (سورہ طلاق آیت ۷)

ترجمہ: اور جس پر رزق تنگ کیا گیا ہے اُسے چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اسکو دیا ہے اس میں سے خرچ کرے۔

بعض مفسرین نے تیسرے احتمال کی معنی مراد لی ہے۔

وقال عطيه العوفى نقدر عليه اى نقضى عليه كانه جَعَلَ ذالك بمعنى التقدير۔

یعنی حضرت یونس علیہ السلام کو یہ گمان ہوا اس معاملہ میں کہ ہم ان پر کوئی فیصلہ نہیں کرینگے، یعنی گرفت ومؤاخذہ نہیں کریں گے اس معنی کے اعتبار سے آیت ہے۔

فالتقى الماءُ على امر قد قدر (سورۃ القمر)

ترجمہ: پس مل گیا پانی ایک انداز پر جس کا فیصلہ کیا گیا۔

Marfat.com

تیسری بحث: حضرت یونس علیہ السلام کا اپنے آپ کو ظالم کہنا

حضرت یونس علیہ السلام نے انی کنت من الظلمین میں اپنے آپ کو ظالم کہا۔ ظلم کبیرہ گناہ ہے۔ گویا حضرت یونس علیہ السلام اعتراف کر رہے ہیں کہ میں نے یہ کبیرہ گناہ کیا ہے۔

وضاحت: ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کا مذکورہ عمل گناہ نہیں تھا، کیونکہ عذاب کے وقت انبیاء علیہم السلام کا اپنی قوم میں سے نکل کر چلے جانے والا عمل حضرت یونس علیہ السلام کے سامنے تھا۔ اسلئے انہوں نے اجتہاد کیا کہ اب مجھے بھی یہاں سے چلا جانا چاہئے۔ اب اس سلسلہ میں مجھ پر کوئی تنگی وغیرہ کا فیصلہ نہیں کیا جائے گا کیونکہ اتمام حجت ہو چکا ہے لیکن افضل واعلیٰ یہ تھا کہ حضرت یونس علیہ السلام اللہ عزوجل کی طرف سے ہجرت کے صریح حکم ملنے کا انتظار کرتے۔

اس دعا میں حضرت یونس علیہ السلام کا اپنے آپ کو ظالم کہنا عجز وانکساری کا اظہار ہے۔ بارگاہِ ایزدی میں انبیاء علیہم السلام کے تواضع اور عجز کا معیار بلند ہوتا ہے، نبوت کے عظیم منصب پر فائز ہوتے ہوئے اپنے آپ کو بھلا دینا، گریہ وزاری کرنا یہ شانِ نبوت ہے اور اس خلافِ اولیٰ ارتکاب کی وجہ سے اپنے آپ کو ظالم کہنا یہ مقام تضرع ہے۔ (نہ یہ کبیرہ کا اعتراف ہے) نیز انبیاء علیہم السلام کے ایسے معاملات کو حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْنَ کے اصول سے دیکھنا چاہئے۔

چوتھی بحث: حضرت یونس علیہ السلام کا اپنے اجتہاد سے ہجرت کرنا

فَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ وَلَا تَکُنْ کَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ اِذْ نَادٰی وَھُوَ مَکْظُوْمٌ (سورہ قلم)

اب تو استقلال سے راہ دیکھتا رہ اپنے رب کے حکم کی اور مت ہو جیسا ہوا وہ مچھلی والا جب اس نے پکارا حالانکہ وہ غم زدہ تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا جاتا ہے کہ آپ صبر کریں آپ مچھلی والے (حضرت یونس علیہ السلام) کی طرح نہ ہو جائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت یونس علیہ السلام بے صبر تھے۔ ان پر نبوت کا بوجھ بھاری ہوا اسلئے ان کو مچھلی کے پیٹ میں تکلیف دی گئی۔

Marfat.com

وضاحت: ولاتکن کصاحب الحوت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نے نبوت یا احکامِ خداوندی میں کوئی کوتاہی کی تھی جس کی پاداش میں انہیں مچھلی کے پیٹ میں قید رکھا گیا بلکہ اصل بات یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کو ہر طرح سے مطمئن کرتے رہتے تھے، باوجود مبین دلائل و براھین کے وہ اپنی ضد پر ڈٹے رہتے تھے اور اذیتیں دیا کرتے تھے، یہاں اس آیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمت و حوصلہ دینے کیلئے بتایا جاتا ہے کہ آپ ابھی برداشت کریں، صبر کریں، میرے (اللہ تعالیٰ کے) صریح اذن و اجازت کے بغیر ہجرت کیلئے تیاری نہ کرنا جیسے صاحب حوت (حضرت یونس علیہ السلام) کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا تو اپنی امت کو عذاب کی علامات سنائیں اور میری طرف سے ہجرت کے صریح حکم ملنے کے انتظار کئے بغیر چل پڑے۔ لہٰذا آپ ابھی صبر کریں جب آپکو ہجرت کا حکم ملے گا، اور آپ چلے جائیں گے تو ہم ان کو سزا دیں گے، ان کو سبق سکھائیں گے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ حضرت یونس علیہ السلام کو ہجرت سے نہیں روکا گیا تھا اور نہ ہی ان کو ہجرت کا صریح حکم ہوا تھا انہوں نے انبیاء علیہم السلام کے دستور کے موافق اپنے اجتہاد سے ہجرت کو مناسب سمجھا، لہٰذا یہ گناہ نہ تھا، البتہ غیر اولیٰ کام تھا اور ایسے امور پر انبیاء علیہم السلام کو عتاب ملتے ہیں، نہ کہ عذاب اور یہ عتاب انبیاء علیہم السلام کی عصمت اور عظمت میں کوئی نقص پیدا نہیں کرتا۔ اس طرح غیر اولیٰ امور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی عتاب ہوئے ہیں جیسے جنگ بدر میں قیدیوں سے فدیہ لے کر چھوڑنے پر عتاب ہوا۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہد نہ کھانے کی قسم کھائی تو اس پر عتاب ہوا اگرچہ شہد کا نہ کھانا مباح تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ "مجھے یونس بن متیٰ پر فضیلت نہ دو" درحقیقت یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسر نفسی ہے، اور امت کے ہر فرد کو یہی تعلیم ہے کہ کوئی بھی اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ان لوگوں کیلئے تازیانہ ہے جو حضرت یونس علیہ السلام کو قصوروار ٹھہراتے ہیں۔ (استفادہ: سہل البیان، جواہر القرآن)

Marfat.com

ابحاث حضرت زکریا علیہ السلام کے متعلق

بحث اول: کیا حضرت زکریا علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے قادر مطلق ہونے کا یقین پہلے سے نہیں تھا؟

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِن لَّدُنكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۖ
إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ (سورہ آل عمران آیت ۳۸)

ترجمہ: وہیں دعا کی زکریا نے اپنے رب سے کہا اے رب میرے عطا کر مجھ کو اپنے پاس سے اولاد پاکیزہ بیشک تو سننے والا ہے دعا کا۔

حضرت زکریا علیہ السلام کو حضرت مریم علیہا السلام کے سامنے بے موسم پھل دیکھنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی قدرت کا یقین ہوا معلوم ہوا کہ پہلے اللہ کے قادر مطلق ہونے کا یقین نہیں تھا۔ نیز فرشتہ کی بشارت کے بعد حضرت زکریا علیہ السلام کا کہنا انی یکون لی غلٰم سے مذکور بالا اشکال کی تائید ہوتی ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کو اس بشارت میں بھی شک تھا، تب ہی تو علامت طلب کی۔

وضاحت: یہ بات قطعاً نہیں ہے کہ حضرت زکریا علیہ الصلوٰۃ والسلام کو قدرت ربی پر یقین نہیں تھا، بات اتنی تھی کہ دنیا کا جہان اسباب کا ہے، عادۃً کبر سنی اور عورت کے بانجھ ہو جانے کے بعد اولاد نہیں ہوا کرتی۔ حضرت مریم علیہا السلام کے سامنے بے موسم میوے دیکھ کر حضرت زکریا علیہ السلام کی توجہ اس طرف گئی کہ بڑھاپے میں اولاد کا ملنا بھی بے موسم پھل ہے اور اب میں بوڑھا بھی ہو چکا ہوں اس عمر میں مجھے ضرورت بھی ہے تو کیوں نہ اللہ رب العزت سے بے موسم اولاد کی طلب کروں۔ رہی بات انّی یکون لی غلٰم کی تو یہ قدرت خداوندی کا انکار نہیں تھا بلکہ بشارت کی تکمیل کے

Marfat.com

شوق میں کیفیت کا معلوم کرنا تھا کہ آیا ہم دونوں میاں بیوی بوڑھے ہی رہیں گے یا ہم جوان ہو جائیں گے؟ ہماری کیفیت کیسی ہو گی؟ تو کذالك الله یفعل مایشاءُ سے اس کا جواب دیا کہ تم اسی حالت میں بوڑھے ہی رہو گے۔

اور فرمایا وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ (سورۃ انبیاء آیت ۹۰)

یعنی ہم نے اس کی بیوی کو اچھا کر دیا، اس میں اس طرف اشارہ دیا گیا کہ ویسے تو اس عمر میں بچہ جننے کی صلاحیت عادتاً نہیں ہوا کرتی، وہ بانجھ ہو چکی ہے لیکن ہم نے اسکا بانجھ پن دور کر دیا اور وہ صلاحیت پیدا کر دی ہے۔ لہٰذا زوجین کے بوڑھے ہونے کی حالت میں بچہ ہو گا، جس کی علامت یہ ہو گی کہ آپ تین دن تین راتیں لوگوں سے بجز اشارہ کے کلام نہیں کر سکیں گے باوجودیکہ آپ کی زبان درست ہو گی کوئی بیماری بھی نہ ہو گی نہ گونگا پن ہو گا، البتہ ذکر اللہ سے زبان رواں دواں ہو گی لہٰذا ذکر، تسبیح و تقدیس میں مشغول رہئے۔ (استفادہ: سہل البیان، مظہری، معارف القرآن)

بحث ثانی: حضرت زکریا علیہ السلام کا وارث طلب کرنا کیا معنیٰ رکھتا ہے

یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ (سورہ مریم آیت ۶)

اور جو وارث بنے میرا اور وارث بنے آل یعقوب کا۔

حضرت زکریا علیہ السلام نے لڑکے کی طلب میں علت بیان کی کہ وہ میرا وارث بنے۔ حالانکہ حدیث شریف میں ہے، نحن معاشر الانبیاء لانورث ماترکناہ صدقة۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم انبیاء کی جماعت میراث نہیں چھوڑتے جو کچھ چھوڑتے تو وہ صدقہ ہوتا ہے۔

وضاحت: یہاں میراث سے مراد میراث مال کی نہیں ہے بلکہ علم و حکمت، دیانت، تقویٰ اور خاندان کی خصوصیات مراد ہیں۔ ویرث من آل یعقوب سے اسی کی توثیق ہوتی ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے آل یعقوب کی تمام املاک کا تن تنہا حضرت یحیٰ وارث ہو!! لہٰذا اس وضاحت سے ثابت ہوا کہ اس آیت اور اس حدیث کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔ (استفادہ: قصص القرآن، سہل البیان)

Marfat.com

بحث: حضرت یحیٰ علیہ السلام کے متعلق

حضرت یحیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا حصور ہونا

اَنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکَ بِیَحْیٰی مُصَدِّقًا بِکَلِمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ سَیِّدًا وَّ حَصُوْرًا وَّ نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ۔ (سورہ آل عمران آیت ۳۹)

(حضرت زکریا علیہ الصلوٰۃ والسلام کو فرشتہ نوید سناتے ہوئے بتا رہا ہے کہ) اللہ تعالیٰ تجھ کو خوشخبری دیتا ہے، یحیٰ کی جو گواہی دیگا اللہ کے حکم کی اور سردار ہوگا اور عورت کے پاس نہ جاوے گا اور نبی ہوگا صالحین سے۔

بحث: "حصور" سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یحیٰ علیہ السلام شادی نہ کرینگے اس وجہ سے کہ وہ قوت مردمی سے محروم ہونگے اسلیئے شادی ان کیلیئے بیکار ہوگی یا اس لئے کہ افضل طریقہ یہ ہے کہ شادی نہ کی جائے، کیونکہ لفظ "حصور" یہاں حضرت یحیٰ علیہ السلام کے لئے مدح کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے اگر پہلی معنٰی مراد ہے یعنی قوت مردمی سے محروم ہونا تو یہ خصلت مرد میں نقص اور عیب ہے حالانکہ انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے جسمانی عیوب سے بھی پاک وصاف رکھا ہے۔ اور اگر شادی نہ کرنا افضل ہے تو تمام انبیاء علیہم السلام نے اس پر عمل نہیں کیا بلکہ انہوں نے شادیاں کیں، کئی کئی نکاح یک وقت کر رکھے تھے۔ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کئی نکاح کئے اور وہ اصحابِ کرام جو شادیاں کرنے سے کنارہ کشی کرتے تھے ان کو اچھا نہ دیکھا۔ تو یہ صفت حضرت یحیٰ علیہ السلام میں کس طرح مدح کی حیثیت رکھتی ہے؟

Marfat.com

وضاحت: لفظ "حصور" اسم مبالغہ ہے اصلہ من الحصر وھوالحبس، یعنی رکنا۔ بعض مفسرین عظام نے حصور بمعنی عنین یعنی نامرد کہا ہے۔ لیکن یہ معنی غلط ہے کیونکہ اس سے نقص و عیب ثابت ہوتا ہے، نقاد علماء کرام نے اس معنی کا انکار کیا ہے۔

وہ فرماتے ہیں اَنَّ الحصور ھو الممتنع عن الوطیء مع القدرۃ علیه وانما ترکهٗ للعفة والزھد فیه وھٰذا القولُ ھُوالصَّحِیۡحُ وَھُوَ قَوۡلُ جَمَاعَةِ المحققین وھوالیق بمنصب الانبیاء (تفسیر خازن)

یعنی حصور کی معنی ہیں طاقت کے باوجود وطی سے دور رہنا اور وطی کو ترک کرنا یہ عفت اور زہد کی وجہ سے ہو۔ یہی صحیح قول ہے اور یہی محقق جماعت کا قول ہے اور یہی انبیاء علیہم السلام کے مناسب ہے۔

باقی رہی بات یہ کہ افضل تو شادی کرنا ہے جیسا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا عمل رہا ہے۔ تو اس میں حالات اور کیفیات کو دیکھا جائے گا جس شخص کی حالت ایسی ہو کہ اس پر آخرت کا خیال اس قدر غالب ہو کہ غلبہ کی وجہ سے نہ بیوی کی ضرورت محسوس کرے اور نہ بیوی بچوں کے حقوق ادا کرنے کی فرصت ہو تو ایسے شخص کیلئے افضل یہی ہے، کہ شادی نہ کرے۔ اسی وجہ سے جن احادیث میں نکاح کی فضیلت آئی ہے ان میں یہ بھی قید مذکور ہے مَنِ اسۡتَطَاعَ مِنۡكُمُ الۡبَاءَةَ یعنی جو آدمی نکاح کی قدرت رکھتا ہو اور زوجیت کے حقوق ادا کر سکتا ہو تو اسکے لئے نکاح کرنا افضل ہے ورنہ نہیں۔

(استفادہ: معارف القرآن)

حضرت مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی اس طرح رقمطراز ہیں "حصور" کے معنی قوت مردمی سے محروم ہونا قطعاً باطل ہیں اسلئے کہ یہ معنی مرد کیلئے مدح کے نہیں بلکہ نقص اور عیب ہیں، اس بناء پر محققین نے اپنی تفاسیر میں اس کو مردود قرار دیا ہے اور قاضی عیاض نے شفاء میں اور خفاجی نے اس کی شرح نسیم الریاض میں اس پر سخت نقد، چینی کر کے جمہور کے نزدیک اس قول کو باطل ٹھہرایا ہے۔

البتہ بقاء قوت کے باوجود اس پر قابو پانے کیلئے خدا کے برگزیدہ انسانوں کے ہمیشہ

Marfat.com

سے دو طریقے رہے ہیں، ایک یہ کہ تجرد و تبتل کی زندگی اختیار کر کے مجاہدات وریاضات اور نفس کشی کے ذریعہ ہمیشہ کیلئے اس کو دبا دیا جائے، گویا اس کو فنا کر دیا گیا۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی زندگی مبارک میں یہی پہلو زیادہ نمایاں ہے اور یحیٰ (علیہ السلام) میں خدائے تعالیٰ نے یہ وصف بغیر مجاہدہ وریاضت ہی کے بدء فطرت میں ودیعت کر دیا تھا۔

اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس کو اس درجہ قابو میں رکھا جائے اور اس پر اس حد تک ضبط قائم کیا جائے کہ وہ کبھی ایک لمحہ کیلئے بھی بے محل حرکت میں نہ آنے پائے بلکہ بے محل حرکت میں آنے کا خطرہ تک باقی نہ رہے لیکن بقاء نسل انسانی کیلئے صحیح طریقہ کار کے ذریعہ تَاَهُّلُ (ازدواجی) زندگی اختیار کی جائے۔

پہلا طریقہ اگرچہ بعض حالات میں محمود ہوتا ہے مگر فطرت انسانی اور حیات اجتماعی کیلئے غیر مناسب ہے پس جن انبیاء علیہم السلام نے اس طریق کار کو اختیار فرمایا وہ وقت کی اہم ضرورت کے پیش نظر تھا خصوصاً جبکہ ان کی دعوت خاص خاص قوموں میں محدود تھی، لیکن جماعتی حیات کیلئے فطرت کا حقیقی تقاضا صرف دوسرا طریق کار پورا کرتا ہے اور اسلئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور آپ کا ذاتی عمل اسی طریق کار کی تائید کرتے ہیں اور آپکی بعثت "کافۃ للناس" تمام عالم کیلئے ہے تو ایسی صورت میں آپ کے لائے ہوئے "دین فطرت" میں اسی کو برتری حاصل ہونی چاہیئے تھی، چنانچہ آپ نے متعدد شعبہ ہائے حیات میں اس حقیقت کی جانب توجہ دلائی ہے کہ دنیا کے معاملات سے جدا ہو کر پہاڑوں کے غاروں اور بیابانوں میں زندگی گذارنے والے شخص کے مقابلہ میں اس شخص کا مرتبہ خدا کے یہاں زیادہ بلند ہے جو دنیوی زندگی کے معاملات میں مقید رہ کر ایک لمحہ کیلئے بھی خدا کی نافرمانی نہ کرے اور قدم قدم پر اس کے احکام کو پیش نظر رکھے۔

Marfat.com

ابحاث حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق

وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَ اُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۗ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَ لَاۤ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ

(سورہ المائدہ: آیت ۱۱۶)

ترجمہ: اور جب کہے گا اللہ اے عیسیٰ مریم کے بیٹے تو نے کہا لوگوں کو کہ ٹھر الو مجھ کو اور میری ماں کو دو معبود سوا اللہ کے، کہا تو پاک ہے مجھ کو لائق نہیں کہ کہوں ایسی بات جس کا مجھ کو حق نہیں اگر میں نے یہ کہا ہو گا تو تجھ کو ضرور معلوم ہو گا تو جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے جی میں ہے بیشک تو ہی ہے جاننے والا ہے چھپی باتوں کا۔

بحث اول: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا صفائی دینا

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام صفائی دینگے کہ میں نے کبھی ایسی جرأت نہیں کی کہ لوگوں کو اپنی یا اپنی ماں کی بندگی کا حکم دیتا اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کو پہلے سے ہی معلوم ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے ایسی بات نہیں کی پھر عیسیٰ علیہ السلام سے اُس طرح کا سوال کرنا تو عبث ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس عبث کرنے سے پاک ہے۔

وضاحت: یہ استفہام عبث نہیں ہو گا بلکہ اس سوال سے قیامت کے دن نصاریٰ کے سامنے ان کے دعوے کو جھوٹا ثابت کرنا ہو گا تا کہ ان کی تذلیل ہو جائے۔

Marfat.com

وجہ ھٰذا السوال تثبیت الحجۃ علیٰ قومہ واکذاب لھم فی ادعائھم ذالک علیہ۔ (تفسیر خازن، سورہ المائدہ)

اس سوال کی وجہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم پر حجۃ ثابت ہو جائے اور ان کے دعوے جھوٹ ثابت ہو جائے۔

لفظ نفس کی تحقیق

تعلم مافی نفسی ولا اعلم مافی نفسک

تو جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے جی میں ہے۔

بحث ثانی: لفظ نفس، ذات الجسد چیز کیلئے استعمال ہوتا ہے ولا اعلم مافی نفسک سے اللہ تعالیٰ کیلئے جسمیت ثابت ہوتی ہے!!

وضاحت: لفظ نفس مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے، یہاں لفظ نفس سے مراد ذات ہے۔

والنفس عبارۃ عن ذات الشیء یقال نفس الشیء و ذاتہ بمعنی واحد (تفسیر خازن)

یعنی نفس کا لفظ کسی چیز کی ذات پر اطلاق کیا جاتا، نفس الشیء کہا جائے یا اس کی ذات کہا جائے ایک ہی معنی ہے۔

دوسری جگہ فرمایا

وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفۡسَہٗ اور ڈراتا ہے اللہ تعالیٰ تم کو اپنی ذات سے فنفسہٗ ذاتہٗ یعنی اس کا نفس یعنی اس کی ذات۔ (المفردات فی غریب القرآن)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنی امت کے بابت ان تعذبھم کہنا اور تخییر والی راہ اختیار کرنا

اِنۡ تُعَذِّبۡہُمۡ فَاِنَّہُمۡ عِبَادُکَ ۚ وَاِنۡ تَغۡفِرۡ لَہُمۡ فَاِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ

(سورہ المائدہ: آیت ۱۱۸)

ترجمہ: اگر تو انکو عذاب دے تو وہ بندے ہیں تیرے اور اگر تو اُن کو معاف کردے، تو تو ہی ہے زبردست حکمت والا۔

Marfat.com

اگر وہ جانتے تھے کہ میری امت نے کفر و شرک کیا ہے تو اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا اٹل فیصلہ ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ۔ یعنی اللہ تعالیٰ مشرک کو کبھی نہیں معاف کرتے۔ تو پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مناسب نہیں کہ مغفرت کی بات کرتے اور اگر وہ منجانب اللہ سمجھتے تھے کہ امت کو مغفرت مل جائیگی تو پھر عذاب کی بات کرنے سے کیا یہ بہتر نہ تھا کہ اپنی امت پر ترس کھاتے ہوئے فقط مغفرت کی طلب کرتے۔

وضاحت: توجیہ ۱: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اس طرح کہنے سے مقصد سارے معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنے اور اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر اعتراض نہ کرنے کا اعتراف ہے اور اس قول "لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ" (یعنی اللہ تعالیٰ جو کچھ کرے اس سے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے) پر عمل کرنے کا اظہار تھا۔ (عصمت انبیاء)

توجیہ ۲: اِنْ تُعَذِّبْھُمْ اَیْ مَنْ اَقَامَ عَلَی الْکُفْرِ مِنْھُمْ فَاِنَّھُمْ عِبَادُكَ وَاَنْتَ مَالِکُھُمْ تَتَصَرَّفُ فِیْھِمْ کَیْفَ شِئْتَ لَا اِعْتِرَاضَ عَلَیْكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَھُمْ اَیْ لِمَنْ اٰمَنَ مِنْھُمْ فَاِنَّكَ انت العزیز الغالب علی اَمرِہٖ الحکیم فی صُنعِہٖ (جلالین)

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت کے سب افراد ایک جیسے نہیں تھے، کچھ لوگ تو ایمان و عقیدہ توحید پر ثابت قدم رہے گرچہ ان سے عملی کوتاہیاں سرزد ہوئیں۔ آپ اگر ان کی مغفرت کردیں تو وہ بھی آپ ہی کے بندے ہیں اور کچھ لوگوں نے شرک و کفر کی راہ لے لی، وہ تو آپ کے عذاب کے مستحق ہیں۔ اگر آپ انہیں عذاب دیں گے تو آپ کا عذاب دینا حکمت و عدل کے عین مطابق ہوگا، آپ سے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اس کے بعد آنے والی آیت اس مطلب کی تائید کرتی ہے۔

قال اللہ ھٰذا یوم ینفع الصادقین صدقھم۔ الاٰیۃ۔

ترجمہ: (تو اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تسلی دیتے ہوئے) فرمائیں گے یہ دن ہے کہ کام آویگا سچوں کے ان کے سچ۔ اُنکے لئے ہیں باغ جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں رہا کریں گے اُنہی میں ہمیشہ۔ اللہ راضی ہوا اُن سے اور وہ راضی ہوئے اُس سے یہی ہے بڑی کامیابی۔

Marfat.com

بحث: حضرت مریم علیہا السلام کا موت کی تمنی کرنا

حضرت مریم علیہا السلام کا موت کی تمنی کرنا

قَالَتْ يٰلَيْتَنِىْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا۔ (سورہ مریم آیت ۲۳)

کاش اس سے پہلے ہی مر گئی ہوتی اور بھولی بسری ہو جاتی۔

بحث: حضرت مریم سلام اللہ علیہا، اللہ تعالیٰ کے چنے ہوئے بندوں میں سے تھی، بڑے مقام والی عورت تھی، وہ تکلیف کے وقت میں موت کی تمنا کیسے کرنے لگی، حالانکہ دکھ یا مصیبت کی وجہ سے موت کی تمنا جائز نہیں ہے۔

وضاحت: توجیہ ۱: ممکن ہے بنی اسرائیل کی شریعت میں تمنا موت کی ممانعت نہ ہو یا بعد میں ممانعت ہوئی ہو اور یہ واقعہ پہلے کا ہو۔

توجیہ ۲: بے اختیاری کی حالت میں بلا ارادہ حضرت مریم علیہا السلام کے زبان سے یہ الفاظ نکل گئے۔

توجیہ ۳: حضرت مریم علیہا السلام کو اپنے دین کی تباہی کا خیال پیدا ہو گیا۔ یہ الفاظ دینی تحفظ کے پیش نظر انہوں نے کہہ دیئے، اور فتنہ کے خوف سے موت کی تمنا جائز ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ (استفادہ: تفسیر مظہری)

Marfat.com

ابحاث حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق

پہلی بحث: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابلاغ رسالت کے متعلق

یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ

(سورہ المائدہ: آیت ۶۷)

ترجمہ: اے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) جو تجھ پر تیرے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اسے پہنچا دے اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس پیغمبری کا حق ادا نہیں کیا۔

بحث: کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ادائے رسالت میں کوتاہی کر رہے تھے، اگر کسی موقعہ پر آپ سے کوتاہی ہوئی ہے تو یہ شانِ نبوت و منصب رسالت کے لائق نہیں اور اگر آپ نے ابلاغِ رسالت میں کوئی کوتاہی نہیں کی تو پھر یہ فرمان عبث ہو گا۔

وضاحت: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابلاغِ توحید، ادائے رسالت میں کبھی کوتاہی نہیں کی بلکہ تبلیغ کا حق ادا کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اِنَّهٗ صلی اللہ علیہ وسلم لَوْ تَرَكَ اِبْلَاغَ الْبَعْضِ كَانَ كَمَنْ لَّمْ یُبَلِّغْ شَیْئًا مِّمَّا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَحَاشَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اَنْ یَّكْتُمَ شَیْئًا مِّمَّا اُوْحِیَ اِلَیْهِ۔ (خازن ج ۱ ص ۵۱۲)

اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ رسالت میں تھوڑی سی چیز بھی چھوڑ دیتے تو ایسا ہو گا جیسا کچھ بھی نہ پہنچایا یعنی گویا تبلیغ رسالت کی ہی نہیں اور یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کی جائے اور آپ اس میں سے کوئی چیز چھپا کر رکھیں۔

Marfat.com

رَوٰی مَسْرُوْقٌ عَنْ عَائشة قالت مَنْ حَدَّثَکَ اَنَّ رَسُوْلَ اللہ ﷺ کَتَمَ شَیْئًا مِمَّا اُنْزِلَ اِلَیہِ فَقَدْ کَذَبَ ثُمَّ قَرَأَتْ یاایّھا الرسول بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِکَ اَخْرَجَاہُ فی الصحیحین۔ (خازن ج ۱ ص ۵۱۲)

حضرت مسروق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں، فرماتی ہیں کہ (اگر) کوئی شخص آپ سے یہ بات کہہ دے کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ میں سے کچھ چھپایا ہے تو (یقین کرلو کہ) اس نے جھوٹ بولا، پھر اس آیت کو پڑھا یاایھا الرسول بلغ۔۔۔ الایۃ۔

آپ ﷺ کا ادائے رسالت و تبلیغ میں کماحقّہ کوشش کا یہ نتیجہ تھا کہ حضرات صحابہ کرام نے جو کچھ آپ ﷺ سے سنا اس کو ذمہ داری کے ساتھ بھاری امانت سمجھ کر اوروں تک پہنچایا، اگر کسی خاص سبب یا مجبوری سے کسی خاص حدیث کو لوگوں سے بیان نہیں کیا تو اپنی موت سے پہلے دو چار آدمیوں کو ضرور سنا دیا تاکہ وہ اس امانت سے سبکدوش ہو جائیں۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث کے متعلق ایسا ہی واقعہ مذکور ہے۔

اَخْبَرَ مُعَاذٌ عِنْدَ مَوْتِہٖ تَاَثُّمًا

یعنی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث اپنے موت کے وقت بیان فرمائی تاکہ اس امانت کے نہ پہنچانے کی وجہ سے گنہگار نہ ہو جائیں۔ قال الزہریؒ

مِنَ اللہِ الرِّسَالَۃُ وَعَلَی الرَّسُوْلِ الْبَلَاغُ وَعَلَیْنَا التَّسْلِیْمُ، وَقَدْ شَھِدَتْ لَہٗ اُمَّتُہٗ بِاِبْلَاغِ الرِّسَالَۃِ وَاَدَاءِ الْاَمَانَۃِ (ابن کثیر ج ۲ ص ۱۰۸)

حضرت امام زہریؒ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول بنانا ہے اور رسول کی ذمہ داری امت تک پہنچانا ہے اور ماننا ہم پر لازم ہے اور ادھر دیکھتے ہیں تو آپ ﷺ کیلئے پوری امت، ابلاغ رسالت اور ادائے امانت کی گواہی دے چکی ہے۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر آپ ﷺ نے اپنے خطبے میں فرمایا:

Marfat.com

اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّكُمْ مَسْئُوْلُوْنَ عَنِّیْ فَمَا اَنْتُمْ قَائِلُوْنَ
قَالُوْا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّیْتَ وَنَصَحْتَ۔

اے لوگو! میرے متعلق آپ سے پوچھا جائے گا پس آپ لوگ کیا کہتے ہیں؟ حضرات صحابہ کرام نے عرض کیا ہم گواہی دیتے ہیں کہ بیشک آپ نے (وحی کو) پہنچا دیا اور ادا کر دیا۔ اور (لوگوں کے ساتھ) خیر خواہی کی۔

مطلب کہ چشم دید گواہ ہیں صحابہ کرام انہوں نے وضاحت کر دی کہ آپ ﷺ نے ابلاغ ورسالت میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اب رہتی ہے بات کہ پھر یہ حکم عبث ہوگا، تو اس سلسلہ میں عرض یہ ہے۔

روی عن الحسن اَنَّ الله تعالیٰ لَمَّا بعثَ رَسُوْلَهٗ ﷺ ضَاقَ ذَرْعًا وَّعَرِفَ اَنَّ مِنَ النَّاسِ مَنْ یُّكَذِّبُهٗ فَاُنْزِلَ هذه الاٰیةُ۔ (خازن ج ۱ ص ۵۱۱)

اللہ تعالیٰ نے جب آپ ﷺ کو مبعوث فرمایا تو بتقاضہ بشریت آپ ﷺ نے تنگی محسوس کی اور محسوس کیا کہ کچھ لوگ آپ کو جھٹلائیں گے تب یہ آیت نازل ہوئی۔

تو اس حکم کا مقصد ہمت دلانا ہے نہ کہ کوتاہی کی نشاندہی کرنا۔ اس حکم کے بعد آپ ﷺ کو تسلی دی جاتی ہے واللهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ یعنی۔ لوگ آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ خود آپ کی حفاظت فرمائیں گے۔

(استفادہ: خازن، ابن کثیر، معارف القرآن)

دوسری بحث: کیا آپ ﷺ نے فقراء المسلمین کو دھتکارا تھا؟

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ (سورہ انعام: آیت ۵۲)

ترجمہ: اور مت دور کر ان لوگوں کو جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح وشام اور چاہتے ہیں اسکی رضا۔

بحث: آپ ﷺ سے امراء مکہ نے غرباء فقراء کو مجلس سے دور کرنے کا مطالبہ کیا تو آپ نے ان مسلمان فقراء کو کفار کے کہنے پر ہٹانے، دھتکارنے کا ارادہ کیا اسلئے

Marfat.com

آپ کو روکا گیا، تو مسلمانوں کو اس طرح اس وجہ سے دھتکارنا گناہ ہے۔

وضاحت: آیت کریمہ سے یہ ثابت بلکل نہیں ہوتا کہ آپ نے ان مساکین وضعیف مسلمانوں کو دور کر رکھا تھا۔

ان النبی ﷺ ماطردھم ولاھمّ بطردھم لاجل الاستخفاف بھم والاستنکاف من فقرھم وانما کان ھذا الھم لمصلحۃ وھو التلطف بھولاءِ الاشراف فی ادخالھم فی الاسلام فکان ترجیح ھذا الجانب اولیٰ وھو اجتھاد منہ فاعلمہُ اللہ تعالیٰ ان ادناء ھٰؤلاءِ الفقراء اولیٰ من الھم بطردھم۔ (خازن ج ۲ ص ۱۹)

آپ ﷺ نے ان فقراء مسلمین کو ان کے فقر کی وجہ سے معمولی سمجھ کر یا نفرت کرتے ہوئے نہ دھتکارا تھا نہ دھتکارنے کا ارادہ کیا تھا، آپ ﷺ کا ارادہ ایک مصلحت کا تھا وہ ان امراء ورساء مکہ کے ساتھ کچھ نرمی کا تھا تاکہ وہ اسلام میں داخل ہو جائیں پس اس جانب آپ نے ترجیح اولیٰ سمجھی یہ آپ کا اجتہاد تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو معلوم کروایا کہ ان فقراء کو قریب رکھنا اس ارادہ سے بھی والیٰ ہے۔

تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ان مساکین کو دھتکارنے کا ارادہ بھی نہیں کیا تھا۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے آپ ﷺ نے رؤساء مشرکین کے ساتھ جدا وقت میں الگ مجلس قائم کرنے کیلئے سوچا ہو، اس کو مجازاً طرد سے تعبیر فرما دیا گیا ہو کہ ایسا کرنا بھی آپ کے شانِ عالی کے منافی ہے۔

باقی یہ بات کہ فتکون من الظالمین فرمایا گیا یعنی اسکو ظلم سے تعبیر کیا گیا، تو اسکا جواب یہ ہے۔

فان الظلم فی اللغۃ وضع الشی فی غیر موضعہ فیکون المعنی ان اولئك الفقراء الضعفاء یستحقون التعظیم والتقریب۔ (خازن ج ۲ ص ۱۹)

یعنی ظلم کے لغوی معنی بے جا اور بے موقعہ کام کرنے کے ہیں پس مطلب ہو گا کہ ان فقراء ومساکین کو قریب رکھنا ان کا حق ہے، اس لحاظ سے خلافِ اولیٰ کو ظلم کہا گیا ہے۔

Marfat.com

رہی بات یہ کہ بعض روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی ایسا مشورہ دیا تھا، پھر حضرت عمر نے عذر بھی کیا تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ (استفادہ: تفسیر خازن، تفسیر کمالین، شرح اردو علیٰ تفسیر جلالین)

تیسری بحث: جنگ بدر کے قیدیوں کے متعلق

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ ؕ (سورہ الانفال: آیت ۶۷)

نبی کو نہیں چاہئے کہ قیدیوں کو اپنے ہاں رکھے، جب تک خوب خونریزی نہ کرلے ملک میں۔

بحث ۱: ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قتل عام کیئے بغیر قیدیوں کو رکھنا درست نہ تھا۔

وضاحت: اسی جنگ بدر میں بعض کفار قتل کئے گئے اور بعض قتل نہیں کئے گئے بلکہ انہیں قید رکھا گیا، اس سلسلہ میں آپ ﷺ نے حضرات صحابہ کرام سے مشورہ لیا تھا حضرات صحابہ کرام کی اکثریت نے قیدی بنانے اور فدیہ لے کر چھوڑدینے کی تجویز دی تھی، اگر قید نہ کرنے بلکہ قتل کرنے کا کوئی نص ہوتا تو یقیناً آپ ﷺ مشورہ نہ لیتے۔ لہٰذا اس عمل کو کسی بھی طرح گناہ نہیں کہا جاسکتا۔

بحث ۲: آپ ﷺ نے فدیہ لے کر کفار کو چھوڑ دیا۔ "تریدون عرض الدنیا" میں اس فعل کی مذمت کی جاتی ہے۔ اور لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ۔۔۔ الآیۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل گناہ تھا۔

وضاحت: اگر یہ عمل غلط اور خطا ہوتا تو اللہ تعالیٰ اسکو ضرور کالعدم قرار دیتے اور قیدیوں کے قتل اور فدیہ کے واپس کرنے کا حکم صادر فرماتے لیکن ایسا ہوا نہیں، درحقیقت بات یہ تھی کہ اگر بدر کے قیدیوں کو قتل کیا جاتا تو کافروں پر مزید ہیبت بڑھ جاتی، اور اسلام کی قوت کا مظاہرہ ہوتا لیکن مسلمانوں نے یہ بات دھیان میں نہ رکھی بلکہ انہوں نے یہ خیال کیا کہ اگر معاوضہ لے کر قیدیوں کو آزاد کردیا جائے گا تو ہوسکتا

Marfat.com

ہے کہ ان قیدیوں میں سے کچھ آئندہ مسلمان ہو جائیں اور ساتھ ہی مال بھی مل جائیگا تو مال ملنے سے مسلمانوں کی جہادی قوت بہت ہی مضبوط ہو جائی گی۔ یہ تھا ان حضرات کا اجتہاد اور یہ ان کی اجتہادی غلطی تھی اسی طرف اس آیت میں اشارہ ہے لولا کتٰب من اللہ سَبَقَ۔۔۔ الایۃ یعنی اگر اللہ تعالیٰ نے پہلے سے لوح محفوظ میں یہ نہ لکھ دیا ہوتا کہ اجتہادی غلطی کرنے والوں پر عذاب نہیں ہو گا تو عذاب آجاتا۔

لہٰذا یہ عمل گناہ کے زمرہ میں نہیں آتا کیونکہ اجتہادی غلطی معافی کے زمرہ میں ہے۔ نیز آنے والی آیت فکلوا مما غنمتم۔۔۔ الایۃ سے اس غنیمت اور فدیہ کو حلال وطیب کہہ کر کھانے اور استعمال کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ سے اس فیصلہ میں کسی قسم کی کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی تھی۔ آپ ﷺ اس سلسلہ میں توبہ واستغفار کی طرف بھی متوجہ نہ ہوئے، تو یہ واضح دلیل ہے کہ آپ کا کوئی گناہ نہ تھا۔

لَوْ کَانَ حَرَامًا فِیْ عِلْمِ اللّٰہِ لَمَنَعَهُمْ مِنْ اَخْذِہٖ مُطْلَقًا۔ (خازن ج ۲ ص ۲۱۰)

اگر یہ فدیہ اللہ کے علم میں حرام ہوتا تو ضرور ان کو منع کرتا۔

(استفادہ: خازن، مظہری، سہل البیان، عصمت انبیاء)

چوتھی بحث: منافقین کے اجازت طلب کرنے پر آپ ﷺ کا اجازت دینا کیا آپکی غلطی تھی:

جنگ تبوک کے موقعہ پر بعض منافقین نے آپ ﷺ سے اجازت طلب کی تو آپ نے انہیں اجازت دیدی، اس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔

عَفَا اللّٰہُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ۔ (سورہ توبہ آیت ۴۳)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے تمہیں معاف کر دیا، تم نے ان کو اجازت کیوں دی۔

بحث: آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے ان منافقوں کو اجازت دے کر غلطی کی تھی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے عفو و درگذر کرنا آپ ﷺ سے گناہ کے

Marfat.com

صادر ہونے پر دلالت کر رہا ہے۔

وضاحت: عَفَا کا لفظ یہاں بمعنیٰ غَفَرَ کے نہیں ہیں۔ مکیؒ کہتے ہیں کہ اَصْلَحَکَ اللّٰہُ اَعَزَّکَ کی طرح عفا اللہ بھی ابتدائے کلام کیلئے آتا ہے۔

قشیریؒ کہتے ہیں کہ جو شخص یہ کہے کہ معافی کا لفظ گناہ کے بغیر بولا نہیں جاتا وہ کلام عرب سے ناواقف ہے۔

سمرقندیؒ کی رائے میں عفااللہ کے معنی عافاک اللہ کے ہے یعنی اللہ آپ کو عافیت سے رکھے (جملہ دعائیہ ہے)

بہر حال معافی کے لفظ سے گناہ کا شبہ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ خلاف اولیٰ پر بھی یہ لفظ بول دیا جاتا ہے اور وہ عصمت کے منافی نہیں ہے۔ وھٰذا یُحْمَلُ عَلٰی تَرْکِ الْاَوْلٰی وَالْاَکْمَلِ۔ یعنی یہ لفظ کسی اکمل اور اولیٰ کے چھوڑنے پر حمل کیا جاتا ہے اور لِمَ اَذِنْتَ میں آئندہ کیلئے محتاط رہنے کی تعلیم ہے۔ پچھلی بات پر عتاب نہیں ہے، پس اس سے بھی کوئی اشکال نہیں ہونا چاہئے۔ (استفادہ: تفسیر کمالین شرح اردو علی تفسیر جلالین، تفسیر خازن)

پانچویں بحث: لَقَدْ تَابَ اللّٰہُ عَلَی النَّبِیِّ کے متعلق

لَقَدْ تَّابَ اللّٰہُ عَلَی النَّبِیِّ وَ الْمُھٰجِرِیْنَ وَ الْاَنْصَارِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْہُ فِیْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ یَزِیْغُ قُلُوْبُ فَرِیْقٍ مِّنْھُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَیْھِمْ ؕ اِنَّهٗ بِھِمْ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ

(سورہ توبہ آیت ۱۱۷)

ترجمہ: اللہ مہربان ہوا نبی پر اور مہاجرین و انصار پر جو ساتھ رہے نبی کے مشکل کی گھڑی میں، بعد اس کے کہ قریب تھا کہ دل پھر جائیں بعضوں کے ان میں سے، پھر مہربان ہوا ان پر بیشک وہ ان پر مہربان ہے رحم کرنے والا ہے۔

(ترجمہ شیخ الہند)

بحث: لفظ توبہ کا استعمال ہوا ہے توبہ تو گناہ و معصیت کی وجہ سے ہوتی ہے آپ ﷺ معصیت سے معصوم ہیں پھر ان کی توبہ کا کیا مطلب؟ اور حضرات صحابہ کرام بھی ایسی مشقت والے سفر میں آپ ﷺ کے ساتھ جہاد کیلئے نکل پڑے تو ان کا کون سا

Marfat.com

قصور و جرم تھا، جس کی انہوں نے توبہ کی۔

وضاحت: توجیہ ا: کوئی گناہ نہ تھا، نہ آپ ﷺ کا نہ آپ کے ساتھیوں حضرات صحابہ کرام کا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے ان کو اس مشقت والے سفر (جنگ تبوک) میں بے سر و سامانی کی حالت میں نکلنے کی توفیق دے کر نافرمانی اور گناہ سے بچا دیا۔ اسی کو توبہ کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان پر مہربانی کی، رحم کیا یا یہ کہ ان سب حضرات کو اللہ تعالیٰ نے توّاب بنا دیا، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ توبہ کی حاجت و ضرورت سے کوئی بھی شخص مستغنی نہیں ہے، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ اور ان کے اصحاب بھی۔ دوسری آیت میں فرمایا وتوبوا الی اللہ جمیعًا۔ یعنی تم سب کے سب اللہ سے توبہ کرو۔ آپ ﷺ ایک مجلس میں ستر سے زیادہ مرتبہ استغفار پڑھ کر اٹھتے تھے، حالانکہ آپ کا کوئی گناہ نہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ استغفار و توبہ بلندی مراتب و تقرب الٰہی کا ذریعہ ہے اور یہی بندگی کی شان ہے۔

تو آیت کا ماحصل یہ ہوا کہ عجز و انکساری کے اعتبار سے یہ توبہ کی گئی تھی۔

توجیہ ۲: حضرات صحابہ کرام مہاجرین و انصار نے اس جنگ میں شدت کی گرمی میں راستہ کی تکلیف اور عدم خوراک و قلت پانی و قلت سواری کی طرح طرح کی تکالیف برداشت کیں، ایسی حالت میں انسان کا مقتضیٰ طبعی ہے کہ اس کے دل میں کچھ وساوس فاسدہ گذریں جیسا کہ آیت میں ایسا اشارہ بھی ہے۔

من بعد ما کاد یزیغ قلوب فریق منھم

کہ قریب تھا کہ اس شدت کے وقت میں بعض مومنین کے دل پھر جاویں یعنی پیچھے رہ جانے یا واپسی کا قصد کریں، یہاں جو قلوب کا زیغ بیان کیا گیا ہے اس سے مراد دین سے انحراف نہیں ہے بلکہ موسم کی گرمی اور اسباب کی قلت اور لمبے سفر کی مشقت کی وجہ سے ہمت ہار دینا مراد ہے اس قسم کے وساوس جو حضرات صحابہ کرام کو دل میں آئے ان کو گناہ تصور کر کے توبہ و استغفار کرنے لگے، یہ خیالات گرچہ گناہ نہیں لیکن پیغمبر کے صحبت یافتہ مقربین صحابہ کرام برداشت نہ کر سکے۔

Marfat.com

رہی یہ بات کہ آپ ﷺ کا دل تو اس وسوسہ سے پاک صاف تھا تو ان کی توبہ کا کیا مطلب تو اس سلسلہ میں علماء فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کا ذکر تبرکاً ہے صحابہ کرام کا دل خوش کرنے کیلئے، اس طرف اشارہ کیا گیا جو خصوصی عنایات آپ ﷺ پر متوجہ ہوں گی، ان سے تم لوگ بھی محروم نہیں رہو گے۔

(استفادہ: تفسیر حقانی، کمالین، معارف القرآن)

چھٹی بحث: کیا آپ ﷺ کو وحی الٰہی میں شک تھا؟

فَاِنۡ كُنۡتَ فِىۡ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ فَسۡـئَلِ الَّذِيۡنَ يَقۡرَءُوۡنَ الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكَ‌ ۚ لَقَدۡ جَآءَكَ الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِيۡنَ ۙ وَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوۡنَ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ۔ (سورہ یونس آیت ۹۴،۹۵)

ترجمہ: سو اگر تو ہے شک میں اس چیز سے کہ اُتاری ہم نے تیری طرف تو پوچھ ان سے جو پڑھتے ہیں کتاب تجھ سے پہلے بیشک آئی ہے تیرے پاس حق بات تیرے رب سے سو تو ہرگز مت ہو شک کرنے والا۔ اور مت ہو جنہوں نے جھٹلایا اللہ کی باتوں کو پھر تو بھی ہو جائیگا خرابی میں پڑنے والا۔

بحث: کیا آپ ﷺ نے اپنی نبوت اور وحی میں شک کیا تھا؟ جو یہاں اہلِ کتاب سے تصدیق کے متعلق کہا جاتا ہے، اگر آپ ﷺ نے شک کیا ہے تو پھر اور لوگوں کو شک کرنا بطریق اولیٰ درست ہوگا۔

وضاحت: توجیہ ۱: سب سے پہلی بات کہ آپ ﷺ نے کبھی بھی شک نہیں کیا، جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

لَا اَشُكُّ يَا رَبِّ وَلَا اَسْاَلُ اَهْلَ الْكِتَابِ بَلْ اَكْتَفِىْ بِمَا اَنْزَلْتَهٗ عَلَىَّ مِنَ الدَّلَائِلِ الظَّاهِرَةِ۔ (خازن ج ۲ ص ۳۳۴)

یعنی اے میرے پروردگار! مین شک نہیں کرتا اور نہ ہی میں اہل کتاب سے دریافت کرونگا بلکہ آپ نے جو کچھ دلائل نازل فرمائے ہیں میں ان پر اکتفا کرتا ہوں۔

Marfat.com

اس توجیہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت فراء نے کہا اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ اسکے رسول کو شک نہیں ہے۔ لیکن عرب کے محاورہ کے مطابق طرز کلام اختیار کیا گیا ہے جیسے بعض لوگ اپنے غلام کو کہتے ہیں اگر تو میرا غلام ہے تو میرے حکم کی تعمیل کر اگر تو میرا لڑکا ہے تو یہ کام کر، ظاہر ہے کہ حکم دینے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ غلام ہونے میں اور بیٹے کو بیٹا ہونے میں کوئی شک نہیں ہوتا پھر بھی اگر کا لفظ بولتا ہے یعنی عربی میں "لو" کا حرف، تو یہ کلام شکیہ نہیں ہوتا۔

توجیہ ۲: اس خطاب سے مراد دوسرے لوگ ہیں آیت کی تفسیری معنی اسطرح ہوں گی۔

قُلْ یَا مُحَمَّدُ یَا اَیُّهَا الانسانُ الشَّاكُ اِنْ كُنْتَ فِیْ شَكٍّ مِمَّا اَنْزَلْنَا اِلَیْكَ عَلٰی لِسَانِ رَسُوْلِنَا مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وسلم فَاسْئَلِ الَّذِیْنَ یَقْرَءُوْنَ الْكِتَابَ یُخْبِرُوْكَ بِصِحَّتِهٖ وَیَدُلُّ عَلٰی صحة هٰذا التَّاوِیْلَ قوله تعالٰی فِیْ آخِرِ هٰذِهِ السُّوْرَةِ قُلْ یَا اَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ شَكٍّ مِنْ دِیْنِیْ۔ الآیہ۔ فَبَیَّنَ اَنَّ الْمَذْكُوْرَ فِیْ هٰذِهِ الاٰیة عَلٰی سَبِیْلِ الرَّمْزِ هُوَ الْمَذْكُوْرُ فِیْ تِلْكَ الاٰیَةِ عَلٰی سَبِیْلِ التَّصْرِیْحِ۔ (خازن ج ۲ ص ۳۳۴)

یعنی اے محمد کہہ دیجئے اے شک کرنے والے انسان اگر آپ کو اس وحی میں شک ہے جس کو ہم نے اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر نازل کیا ہے تو پھر آپ ان لوگوں سے دریافت کریں جو (اہل کتاب ہیں) کتاب (توراۃ وانجیل) کو پڑھتے ہیں تو آپ کو اس (وحی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت) کی تصدیق کرتے ہوئے خبر دیں گے۔ اس آیت کی اس طرح تاول کرنے میں یہ آیت دلیل ہے۔ قُلْ یَا اَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ شَكٍّ فِیْ دینی۔ الآیۃ اس تشریح پر واضح ہوا کہ جو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے وہ بطور اشارہ کے ہے اور یہی مقصد سورۃ کے آخر حصہ والی آیت میں بطور تصریح کے بیان کیا گیا ہے۔

توجیہ ۳: لفظة ان فی قوله تعالٰی فان کنت فی شك للنفی والمعنٰی وما انت فی شك مما انزلنا الیك حتی تسأل فلا تسال ولئن سالت لازددت یقینا۔ (خازن ج ۲ ص ۳۳۴)

Marfat.com

یعنی حرف اِنْ اس آیت میں نفی کیلئے ہے پھر معنیٰ اس طرح ہونگی ہم نے جو آپ کی طرف نازل کیا ہے تو آپ کو اس میں کوئی شک نہیں ہے جو آپ کو اہل کتاب سے دریافت کرنے کی ضرورت پڑے، پس نہ پوچھیے اگر آپ پوچھ بھی لیں گے تو یقین بڑھنے کے علاوہ اور کچھ نہ ہو گا۔

توجیہ ۴: رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں سچے ایماندار اور اندرون قلب سے انکار و تکذیب کرنے والے کافر یہ دو گروہ تو موجود ہی تھے، ایک تیسرا گروہ بھی (منافقین) جو تصدیق و تکذیب کے درمیان شک میں پڑا ہوا تھا اسی کو اس آیت میں خطاب ہے۔ (مظہری ج۵ ص۳۵۳)

توجیہ ۵: مراد آیت کا ہر سامع ہے یعنی اے سننے والا اگر آپ کو شک ہے تو آپ اس کی تصدیق دیانتدار اہل کتاب سے کریں کیونکہ آپ کی نشانیاں ان کی کتابوں میں اس طرح واضح ہیں جو وہ آپ ﷺ کو رسول اور نبی ہونے پر اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بچوں کو پہچانتے ہیں۔ (استفادہ: خازن، مظہری، سہل البیان)

ساتویں بحث: کیا آپ ﷺ کفار کی باتوں کی طرف مائل ہوئے تھے

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِىْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ (بنی اسرائیل آیت ۷۳)

اور وہ لوگ تو چاہتے تھے کہ تجھ کو بچلا دیں اُس چیز سے جو وحی بھیجی ہم نے تیری طرف۔

بغوی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف نسبت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قبیلہ ثقیف کا وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت تین شرطوں پر کرنے کو تیار ہیں ایک یہ کہ ہم نماز کے اندر جھکیں گے نہیں (یعنی رکوع و سجدہ نہیں کریں گے) دوسری یہ کہ ہم اپنے بتوں کو اپنے ہاتھوں سے نہیں توڑیں گے تیسری بات یہ ہے کہ ہم لات (پر چڑھائے جانے والے نذرانوں) سے ایک سال تک فائدہ لیتے رہیں گے، البتہ اسکی پوجا نہیں کریں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے جواب میں فرمایا جس (دین کی عبادت) کے اندر رکوع و

Marfat.com

سجود نہ ہو اس میں کوئی خیر نہیں۔ رہی یہ بات کہ تم اپنے ہاتھ سے اپنے بتوں کو نہیں توڑو گے تو اس کا اختیار تم کو ہے، باقی طاغیہ یعنی لات وعزیٰ (پر چڑھائے جانے والے نذرانوں) سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں دے سکتا، کہنے لگے یارسول اللہ (ﷺ) ہماری خواہش ہے کہ عرب یہ کہیں کہ کچھ خصوصی چیز آپ نے ہم کو عطا فرمادی ہے جو دوسروں کو عطا نہیں فرمائی اب اگر آپ کو یہ اندیشہ ہے کہ لوگ کہیں گے کہ ثقیف والوں کو آپ نے وہ کچھ دیا جو دوسروں کو نہیں دیا تو آپ جواب میں فرمادیں کہ اللہ نے یہی حکم دیا تھا۔ آپ ﷺ ان کی یہ بات سن کر خاموش ہوگئے ان لوگوں نے حضور انور ﷺ کے سکوت کو رضامندی سمجھ لیا اور خیال کیا کہ آپ ایسا کریں گے، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں، آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے احکام سے نیچے اتار کر آپ کو فتنہ میں مبتلا کرنے کے قریب پہنچ گئے تھے۔

(خازن ج۳ ص۱۸۴)

اس کے بعد فرمایا

لِتَفْتَرِیَ عَلَیْنَا غَیْرَهٗ ۖ وَ اِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِیْلًا ۝ وَ لَوْ لَاۤ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَیْهِمْ شَیْـًٔا قَلِیْلًا ۝ (سورہ بنی اسرائیل آیت ۷۴)

تاکہ جھوٹ بنالائے تو ہم پر وحی کے سوا اور تب تو بنالیتے تجھ کو دوست اور اگر یہ نہ ہوتا کہ ہم نے تجھ کو سنبھالے رکھا تو لگ جاتا جھکنے اُن کی طرف تھوڑا سا۔

(ترجمہ شیخ الہند)

اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَیٰوةِ وَ ضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَیْنَا نَصِیْرًا

(سورہ بنی اسرائیل آیت ۷۵)

تب تو ضرور چکھاتے ہم تجھ کو دونا مزہ زندگی میں اور دونا مرنے میں پھر نہ پاتا تو اپنے واسطے ہم پر مدد کرنے والا۔

بحث: کفار کی ان باتوں کی طرف آپ کا مائل ہونا بھی جائز نہیں ہے لہٰذا آپ کو دوگنے عذاب کی وعید سنائی جارہی ہے۔

وضاحت: توجیہ ۱: آپ ﷺ کا رُکُوْنُ (مائل ہونا) نہیں ہوا۔ وَلَوْلَاۤ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ

Marfat.com

سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر ہم آپ کو حق پر ثابت قدم نہ رکھتے تو قریب تھا کہ آپ ان کے مقصد کو ماننے کی طرف کسی قدر مائل ہو جاتے کیونکہ ان کا فریب سخت اور مکر شدید تھا اور آپ ﷺ کو ان کے مسلمان ہو جانے کی بہت زیادہ خواہش تھی، لیکن ہماری طرف سے آپ کا بچاؤ کر دیا گیا، آپ ان لوگوں کے مقصد کی طرف مائل ہونے کے قرب سے بھی بچ گئے، مائل ہو جانا تو بجائے خود رہا۔ شیئًا قلیلا کا لفظ بتا رہا ہے کہ بجائے خود صلاح و استقامت کی استعداد رسول اللہ ﷺ کے اندر اتنی کامل تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عصمت واجبہ نہ بھی ہوتی، تب بھی آپ کی فطرت سلیمہ اگر گناہ کی طرف مائل ہوتی تو بہت ہی کم میلان ہوتا اور یہ ضروری نہیں کہ گناہ کی طرف ادنیٰ جھکاؤ ہونے کے بعد گناہ کا صدور ہو ہی جاتا۔ اور اب احتمال ہی نہیں رہا کہ گناہ کی طرف مائل ہونے کے قریب بھی آپ پہنچ سکتے۔

نکتہ: دوگنے عذاب کی وعید سنا کر یہ واضح کیا جاتا ہے کہ بڑے مرتبے والے کی تھوڑی فروگذاشت بھی بڑی ہوتی ہے۔

ازواجِ مطہرات، امہات المومنین کو دیکھیں سورہ احزاب کی آیت ۳۰ میں انہیں تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا۔

یُضٰعَفُ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرًا۔

اسی طرح آپ ﷺ کیلئے سورہ الحاقۃ میں فرمایا گیا۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيلِ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ○

اسی طرح تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کیلئے سورہ انعام کی آیت ۸۸ میں فرمایا گیا، ولو اشرکوا لحبط عنهم مّا كانوا يعملون۔ جیسے ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں۔

بہر حال آپ ﷺ اور تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے اس قسم کی کوئی کوتاہی سرزد نہیں ہوئی اور کوئی بھی پیغمبر ایسے مؤاخذہ کی زد میں نہیں آیا۔

توجیہ ۲: آپ ﷺ کا یہ میلان طبعی طور پر ہوا ہوگا تو اس قسم کا میلان قابلِ گرفت عمل نہیں قرار دیا گیا ہے۔ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ الایۃ۔ اس میں ایک طرف بے پرواہ

Marfat.com

بادشاہ کی بے نیازی، قادرِ مطلق، مختارِ کل کی قوت وسطوت اور اس کی عظمت کا اظہار ہے، دوسری طرف آپ ﷺ جیسے افضل الرسل، سردارِ دوجہاں، محبوب کائنات عظیم المرتبت شخصیت ہونے کے باوجود عجز وانکساری کرنے والا بے اختیار بندہ ہونے کا اظہار ہے، یعنی بندہ بندہ ہے، خدا خدا ہے۔

درحقیقت ان آیات کے ذریعہ تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی حیثیت واضح کی جاتی ہے کہ وہ بڑی شان والے تو ہیں لیکن وہ خدائی طاقت اور خدائی اوصاف سے متصف نہیں ہیں بلکہ وہ مسئولیت اور محاسبہ کے دائرہ میں اطاعت الٰہی کے مکلف ہیں۔

(استفادہ: تفسیر خازن، تفسیر مظہری، تفسیر سہل البیان، عصمت انبیاء)

آٹھویں بحث: کیا شیطان وحی الٰہی میں اپنی بات ملا سکتا ہے؟

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ

(سورہ حج: آیت ۵۲)

اور جو رسول بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے یا نبی سو جب لگا خیال باندھنے شیطان نے ملا دیا اسکے خیال میں پھر اللہ مٹا دیتا ہے شیطان کا ملایا ہوا۔

اس آیت کے پس منظر میں بہت سے مفسرین عظام نے یہ روایت پیش کی ہے کہ ایک دن حضور انور ﷺ کافروں کی ایک بڑی مجلس میں تشریف فرما تھے، اور یہ چاہتے تھے کہ آج کوئی ایسا حکم نازل نہ ہو جس سے یہ لوگ متنفر ہو جائیں اس وقت یہ سورہ نازل ہوئی والنجم اذا ھوی۔ آپ ﷺ سورۃ پڑھتے رہے جب ان آیات تک پہنچے افرأیتم اللات والعزیٰ ومناۃ الثالثۃ الاخریٰ۔ ترجمہ: ”کیا تم نے لات اور عزیٰ اور تیسرے مناۃ کے حال کو دیکھا۔“

تو شیطان نے آپ ﷺ کی خواہش کے مطابق زبان اقدس سے یہ الفاظ جاری کیے تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى۔ یعنی یہ بڑی بلند چڑیاں ہیں جن کی سفارش کی امید کی جا سکتی ہے۔

Marfat.com

قریش یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور آپ ﷺ نے تلاوت جاری رکھی جب سورۃ پوری کی تو آپ ﷺ نے اور پوری مجلس نے سجدہ کیا۔ مسجد حرام میں مسلمانوں اور کافروں میں سے کوئی بھی سجدہ کیے بغیر نہ رہا۔ البتہ ولید بن مغیرہ اور سعید بن العاص دونوں نے مٹھی بھر سنگریزہ اٹھایا اور اس پر پیشانی رکھ کر سجدہ کی صورت دکھائی، اسلئے کہ وہ بہت ہی بوڑھے تھے، جھک کر سجدہ کرنے میں تکلیف محسوس کرتے تھے، پھر قریش گھروں کی طرف خوشی مناتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے کہ حضور انور ﷺ نے ہمارے معبودوں کو بہترین انداز میں ذکر کیا ہے چلے گئے، شام کے وقت حضرت جبرئیل امین تشریف لائے اور فرمایا کہ آپ نے یہ کیا کیا؟ لوگوں پر وہ کچھ تلاوت کیا جو میں نہیں لایا تھا اور وہ کچھ کہا جو میں نے نہیں کہا تھا اس پر آپ ﷺ بہت ہی غمگین ہوئے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرے پھر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے یہ آیات نازل کیں۔ (خازن ج۳ ص ۳۱۳)

بحث: آیت کے ظاہر اور اس واقعہ کی تائید سے یہ ثابت ہوا کہ شیطان وحی الٰہی میں ایسی آمیزش کر سکتا ہے جس سے شبہات پیدا ہوں۔ جب معاملہ اس طرح ہو سکتا ہے تو پھر وحی سے اعتماد ہی جاتا رہیگا۔ دوسری طرف وحی کی حفاظت کیلئے صحیح روایات سے ثابت ہے کہ جب آپ ﷺ پر وحی اُترتی تھی تو فرشتوں کی ایک بڑی جماعت آپ کو احاطہ میں لے لیتی تھی تاکہ شیطان وحی میں کچھ خلط ملط نہ کر دے اور خود اللہ رب العزت فرماتے ہیں لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ۔

ترجمہ: نہیں آتا باطل اس کے آگے اور نہ ہی اس کے پیچھے سے۔

اس صورت میں شیطان کا حربہ کس طرح کامیاب ہوا؟

وضاحت: جہاں تک تعلق ہے اس روایت کا تو یہ بلکل غلط ہے اس میں اہل روایت کے اقوال بھی مختلف ہیں، کوئی کہتا ہے یہ واقعہ نماز کے اندر کا ہے کوئی کہتا ہے اس سورۃ کے نزول تلاوت کے وقت رسول اللہ ﷺ قوم کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بعض کہتے ہیں حضور انور ﷺ کے دل میں خود ہی یہ خیال سہواً پیدا ہوا تھا اور

Marfat.com

اونگھنے کی حالت میں یہ بات ہو گئی، بعض قائل ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی آواز بنا کر شیطان نے کلمات کہے تھے۔ (حاشیہ مظہری وخازن ج ۳ ص ۳۱۴)

اس طرح مضطرب باتیں منقول ہیں جو در حقیقت قابل التفات نہیں ہیں۔ بہت مفسرین عظام نے کہا ہے کہ یہ قصہ موضوع اور من گھڑت ہے زندیقوں اور ملحدوں کا ساختہ ہے۔

قال الامام الحافظ ابوبکر احمد بن الحسین البیہقی هذه القصة غیر ثابتة من جهة النقل۔

امام حافظ ابو بکر احمد بن حسین بیہقی نے فرمایا کہ یہ قصہ نقل کے لحاظ سے غیر ثابت ہے، امام قرطبی فرماتے ہیں وَلَیْسَ مِنْهَا شَیْءٌ یَصِحُّ۔
اس سلسلہ میں کوئی چیز صحیح نہیں ہے۔
علامہ خازن فرماتے ہیں۔

اِنَّهٗ لَمْ یَرْوِهَا اَحَدٌ مِنْ اَهْلِ الصِّحَّةِ وَلَا اَسْنَدَهَا ثِقَةٌ بِسَنَدٍ صَحِیْحٍ اَوْسَلِیْمٍ مُتَّصِلٍ۔ (خازن ج ۳ ص ۳۱۳)

اہل صحت رواۃ میں سے کسی نے بھی اسکو روایت نہیں کیا اور کسی ثقہ راوی نے بھی اسکو درست اور متصل روایت سے بیان نہیں کیا۔

امام ابن خزیمہ اور بیہقی کا مذکورہ بالا قول امام رازی نے بھی نقل کیا ہے۔

رُوِیَ عَنْ محمدِ بن اسحاق بن خُزَیْمَةَ اَنَّهٗ سُئِلَ عَنْ هٰذِهِ الْقِصَّةِ فَقَالَ هٰذَا وَضْعٌ مِنَ الزَّنَادِقَةِ وَصَنَّفَ فِیْهِ کِتَابًا۔

محمد بن اسحاق بن خزیمہ سے اس قصہ کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا یہ زندیقوں کا خود ساختہ قصہ ہے اس میں ایک کتاب لکھی ہے۔ امام ابوالسعود فرماتے ہیں وَهُوَ الْمَرْدُوْدُ عِنْدَ الْمُحَقِّقِیْنَ۔ یعنی یہ قصہ محققین علماءِ کرام کے ہاں قابل تردید ہے۔ امام رازی مفسرین اہل التحقیق کا یہ فیصلہ نقل کرتے ہیں۔

اَمَّا اَهْلُ التَّحْقِیْقِ فَقَالُوْا هٰذِهِ الرِّوَایَةُ بَاطِلَةٌ مُوْضُوْعَةٌ۔ لیکن محققین مفسرین

Marfat.com

فرماتے ہیں کہ یہ روایت باطل اور موضوع من گھڑت ہے۔

(بحوالہ جواہر القرآن ج۲ ص ۷۴۳)

آیت کی صحیح تفسیر اس طرح ہو سکتی ہے کہ جب آپ ﷺ تلاوت کے دوران افرأیتم اللات تک پہنچے تو کافر جان گئے کہ ابھی یہ سابقہ عادت کے موافق ہمارے معبودوں کی گستاخی کریں گے اس لئے بعض چالاک آدمیوں نے یہ شوشہ چھوڑ دیا، تلك الغرانیق۔ الخ اور اس سے قوم کو اشتباہ ہونے لگا اور تلاوت کے دوران شور مچانے کی عادت کافروں کی طرف سے تو پہلے ہی سے چلی آرہی تھی اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اقدام انہوں نے نماز کے دوران کیا ہو اس لئے کہ نماز کے وقت یہ لوگ قریب آکر قران سن کر شور مچاتے تھے اسی دوران عام لوگوں نے اس کو تلاوت کا حصہ سمجھا ہو۔ رہی بات شیطان کی طرف نسبت کی؟ تو یہ اسلئے کی گئی کہ جن لوگوں نے یہ حرکت کی تو شیطانی وسوسہ کی وجہ سے کی تھی یا ان الفاظ کے کہنے والے کو شیطان قرار دیا گیا ہے۔ آیت کے اندر لفظ اذا تمنیٰ میں تمنیٰ کے معنی تمنیٰ یعنی خواہش کرنا نہیں ہے بلکہ تلاوت ہے اس معنی کی تائید حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے اس شعر سے ہوتی جو انہوں نے حضرت عثمان کی شہادت کے بعد ان کے شان میں کہا تھا۔

تمنیٰ کتاب اللہ اول لیلة

وَآخرہ لاقی حماد المقادر (خازن ج۳ ص ۳۱۳)

یعنی "حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے رات کی ابتداء میں قران کی تلاوت کی اور رات کے آخری حصہ میں موت مقرر سے جا ملے۔"

حضرت شیخ قدس سرہ فرماتے ہیں کہ آیت کا مطلب یہ ہے۔

(اذا تمنیٰ) ای تلا (القی الشیطان) الوساوس والشبهات فی قلوب السامعین (فی امنیته) ای فی اثناء تلاوته۔

یعنی ہم نے جو بھی رسول یا نبی دنیا میں بھیجا ہے وہ جب بھی اللہ تعالیٰ کی آیتیں لوگوں کو پڑھ کر سناتا شیطان اس دوران میں لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کے

Marfat.com

شبہات ڈالتا تاکہ وہ پیغمبر کی تلاوت سے متاثر نہ ہوں اور کلام اللہ سے بد ظن ہو جائیں اور اسے ماننے سے انکار کر دیں۔ (جواہر القرآن ج ۲ ص ۷۴۳)

حضرت تھانویؒ ان آیات کی تفسیر یوں بیان فرماتے ہیں۔

ہم نے آپ کے قبل کوئی رسول اور کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس کو یہ قصہ پیش نہ آیا ہو کہ جب اس نے (اللہ تعالیٰ کے احکام میں سے) کچھ پڑھا (تب ہی) شیطان نے اس کے پڑھنے میں (کفار کے قلوب میں) شبہ (اور اعتراض) ڈالا (اور کفار انہیں شبہات اور اعتراض کو پیش کر کے انبیاء سے مجادلہ کیا کرتے جیسا کہ دوسری آیات میں ارشاد ہے۔

وکذالک جعلنا لکلّ نبیّ عدوّا شیاطین الانس والجنّ یوحی بعضھم الی بعض زخرف القول غرورا وان الشیاطین لیوحون الی اولیائھم لیجادلوکم۔ پھر اللہ تعالیٰ شیطان کے ڈالے ہوئے شبہات کو (جوابات قاطعہ و دلائل مقاطعہ سے) نیست و نابود کر دیتا ہے (جیسا کہ ظاہر ہے کہ صحیح جواب کے بعد اعتراض دفع ہو جاتا ہے۔

(استفادہ: تفسیر جواہر القرآن، تفسیر مظہری، تفسیر بیان القرآن، تفسیر کمالین علی جلالین، تفسیر خازن، عصمت انبیاء)

نویں بحث: آپ ﷺ کو "اتق اللہ" کے حکم کے متعلق

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۙ وَّ اتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۙ وَّ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا۔ (سورہ الاحزاب آیت ۱ تا ۳)

ترجمہ: اے نبی ڈر اللہ سے اور کہنا مان منکروں کا اور دغابازوں (منافقوں) کا بیشک اللہ تعالیٰ ہے سب کچھ جاننے والا حکمتوں والا اور چل اُسی پر جو حکم آئے تجھ کو تیرے رب کی طرف سے بیشک اللہ تمہارے کام کی خبر رکھتا ہے اور بھروسہ رکھ اللہ پر اور اللہ کافی ہے کام بنانے والا۔

بحث: ان آیات میں آپ ﷺ کو تقویٰ کا حکم دیا گیا ہے اور کفار کی اطاعت

Marfat.com

سے روکا جاتا ہے تو کیا اس سلسلہ میں آپ سے کوئی تقصیر ہوئی تھی؟ اگر نہیں تو پھر یہ امر اور نہی عبث ہو کر رہ جائیں گے۔

وضاحت: یقیناً آپ ﷺ سے اس سلسلہ میں کوئی تقصیر نہیں ہوئی تھی، ان آیات کی تفسیر دیکھنے سے پہلے ان آیات کی شانِ نزول کو دیکھتے ہیں اس میں چند روایات منقول ہیں۔ یہ کہ رسول اللہ ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ طیبہ میں تشریف فرما ہوئے تو مدینہ کے گرد ونواح میں جو یہودیوں کی آبادی تھی آپ ﷺ کی کوشش تھی کہ یہ لوگ مسلمان ہو جائیں اتفاقاً یہودیوں میں سے کچھ آدمی آپ کی خدمت میں آنے لگے اور منافقانہ طور پر اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر کے خدمت اقدس میں شریک ہوتے تھے۔ آپ ﷺ نے اس کو غنیمت سمجھا کہ کچھ لوگ مسلمان ہو جائیں تو دوسروں کو دعوت دینا آسان ہو جائیگا۔ اسلئے آپ ان لوگوں کے ساتھ خاص مدارات کا معاملہ فرماتے، اور ان کے چھوٹے بڑے آنے والوں کا اکرام کرتے تھے اور کوئی بری بات بھی ان سے صادر ہوتی تو دینی مصلحت سمجھ کر اس سے چشم پوشی فرماتے تھے۔ اس واقعہ پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ (معارف القرآن)

دوسرا واقعہ یہ نقل کیا گیا ہے کہ ہجرت کے بعد ولید بن مغیرہ اور شیبہ بن ربیعہ مدینہ عالیہ آئے اور آنحضرت ﷺ کے سامنے یہ پیشکش کی کہ ہم سب قریش مکہ کے آدھے اموال آپ کو دے دیں گے اگر آپ اپنے دعوے کو چھوڑ دیں اور مدینہ منورہ کے منافقین اور یہود نے آپ کو یہ دھمکی دی کہ اگر آپ نے اپنا دعویٰ اور دعوت سے رجوع نہ کیا تو ہم آپ کو قتل کر دیں گے اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ (معارف القرآن)

تیسرا واقعہ یہ ہے جو بغوی نے لکھا ہے ان آیات کا نزول ابوسفیان بن حرب، عکرمہ بن ابی جہل، ابوالاعور، عمرو بن سفیان سلیمی کے حق میں ہوا۔ جنگ اُحد کے بعد یہ اشخاص مدینہ میں آکر سرکردہ منافقین عبداللہ بن ابی بن سلول کے پاس ٹھہرے اور آپ ﷺ سے گفتگو کرنے کی درخواست کی آپ ﷺ نے ان کو اجازت دے دی، چنانچہ عبداللہ بن ابی، عبداللہ بن سعد بن ابی سرح اور طعمہ بن اُبیرق خدمت

Marfat.com

گرامی میں حاضر ہوئے اور رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ آپ لات، عُزیٰ اور مناۃ کا تذکرہ چھوڑ دیجئے ہمارے ان معبودوں کا ذکر برائی کے ساتھ نہ کیجئے اور یہ کہہ دیجئے کہ جو شخص ان کو پوجے گا یہ معبود اس کی شفاعت کریں گے۔ اگر آپ ایسا کرلیں گے تو ہم آپ کے اور آپ کے رب کا ذکر برائی کے ساتھ نہیں کریں گے اور آپ کے کام میں مداخلت نہیں کریں گے، اس وقت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی خدمت میں موجود تھے، حضور انور ﷺ کو کفار کی یہ بات بہت شاق گذری، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ (ﷺ) مجھے اجازت دیجئے میں ان کو قتل کردوں۔ فرمایا میں ان کو امن دے چکا ہوں۔ پھر حضرت عمر نے فرمایا نکل جاؤ تم پر اللہ کی لعنت و غضب ہو پھر آپ ﷺ نے ان کو مدینہ سے نکال دینے کا حکم دے دیا اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ (خازن، مظہری)

توجیہ ۱: ان واقعات کی روشنی میں اِتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰى اِلَيْكَ۔ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اے میرے پیارے پیغمبر! یہ مشرکین آپ کو دین کے معاملہ میں نرم کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا آپ تبلیغ توحید میں ذرہ برابر بھی نرمی اختیار نہ کریں جیسے سورہ قلم میں فرمایا ودّوا لو تدھن فیدھنون۔ وہ چاہتے ہیں کسی طرح تو ڈھیلا ہو تو وہ بھی ڈھیلے ہوں۔

توجیہ ۲: اِتَّقِ اللّٰهَ اَیْ اُثْبُتْ عَلٰی تَقْوَی اللّٰهِ وَدُمْ عَلَيْهِ (مدارک ج۳ ص۲۸۱)

یعنی تقویٰ پر ثابت قدم رہیے اور اس پر مداومت کیجئے۔ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ اَیْ وَلَا تُسَاعِدْهِمْ عَلٰی شَیْءٍ وَاحْتَرِسْ مِنْهُمْ فَاِنَّهُمْ اَعْدَاءُ اللّٰهِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ

یعنی کفار و منافقین کا کسی بھی چیز پر تعاون نہ کیجئے اور ان سے ہر دم چوکس رہئے، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ اور اہل ایمان کے دشمن ہیں۔

وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ فِی الثُّبَاتِ عَلَی التَّقْوٰی وَتَرْكِ طَاعَةِ الْكَافِرِيْنَ وَالْمُنَافِقِيْنَ۔ (مدارک علی ہوامش الخازن ج۳ ص۲۸۱)

Marfat.com

یعنی اللہ رب العزت کی طرف سے تقویٰ پر ثابت قدم رہنے اور کفار و منافقین کی اطاعت کو ترک کرنے میں اس وحی کی اتباع کیجئے۔

توجیہ ۳: بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ خطاب کا رخ اگرچہ رسول اللہ ﷺ کی طرف ہے لیکن تقویٰ کا حکم امت کو دینا مقصود ہے۔

دسویں بحث: آپ ﷺ کا حضرت زینب سے نکاح کرنا

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْهِ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ؕ فَلَمَّا قَضٰى زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَیْ لَا یَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا (سورہ احزاب آیت ۳۷)

ترجمہ: اور جب تو کہنے لگا اس شخص کو جس پر اللہ نے احسان کیا اور تو نے احسان کیا رہنے دے اپنے پاس اپنی جورو کو اور ڈر اللہ سے اور تو چھپاتا تھا اپنے دل میں ایک چیز جس کو اللہ کھولا چاہتا ہے اور (تو) ڈرتا تھا لوگوں سے اور اللہ سے زیادہ چاہیے ڈرنا تجھ کو۔

بحث: اس آیت کی تفسیر میں بعض نادانوں نے بیان کیا ہے کہ حضرت زینب ایک مدت تک حضرت زید بن حارثہ کے پاس رہیں ایک دن آپ ﷺ کسی کام سے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے پاس آئے۔ حضرت زینب تو رنگ کی گوری اور قریش کی حسین ترین عورت تھیں اس وقت کرتہ اور دوپٹہ پہنے کھڑی تھی۔ حضور انور ﷺ کی جو نظر اس پر پڑی تو آپ (ﷺ) کو اچھی معلوم ہوئی اور دل کو بھا گئیں فوراً زبان سے نکلا سبحان اللہ۔ اللہ دل کو پلٹنے والا ہے اس کے بعد آپ ﷺ لوٹ آئے جب حضرت زید رضی اللہ عنہ آئے تو حضرت زینب نے ان کے سامنے یہ بات بیان کی تو حضرت زید سمجھ گئے اور اسی وقت سے حضرت زینب کو ناپسند کرنے لگے اور آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے کہ میں اپنی بیوی کو الگ کرنا چاہتا

Marfat.com

ہوں تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کیا آپ نے ان میں کوئی ایسی چیز دیکھی ہے؟ تو عرض کیا جی نہیں، میں نے خیر ہی دیکھی ہے لیکن بات یہ ہے کہ وہ میرے اوپر اپنے آپ کو بڑا سمجھتی ہے، خاندانی شرافت کی سبب، مجھے اپنی زبان سے تکلیف دیتی ہے، اسی پر آپ ﷺ نے فرمایا امسک علیک الخ۔ یعنی اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھیئے اللہ سے ڈریئے اور کو طلاق نہ دیجئے وتخفی فی نفسک الخ۔ یعنی آپ اپنی چاہت چھپا رہے تھے کہ اچھا ہے کہ زید طلاق دے دے تا کہ میں نکاح کرلوں، اسی کو اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والے ہیں۔

یہ تفسیر بیان کرتے ہیں بعض نااہل، جو کہ آپ ﷺ کے شایانِ شان ہرگز نہیں ہے جس طرح یہودیوں نے حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام اور دوسرے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے متعلق من گھڑت غلط قصے بیان کیے ہیں، اس طرح لگتا ہے کہ منافقین نے آپ ﷺ کی شان و منصب کو داغدار کرنے کیلئے ایسے واقعات افتراء کیے ہیں۔

عجب ہے آپ کی پھوپھی زادی، آپ کے خاندان کی، آپ کے سامنے بچپنے سے بڑی ہوئیں اس وقت پردہ کا حکم بھی نہیں تھا، کیا وہ آپ سے مخفی تھیں؟ جب آپ ﷺ ان کا رشتہ حضرت زید رضی اللہ عنہ سے کرا رہے تھے اور وہ اور ان کے بھائی وغیرہ اس رشتہ میں لیت و لعل اور پس و پیش سے کام لے رہے تھے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا (سورہ احزاب آیت ۳۶)

ترجمہ: اور کام نہیں کسی ایماندار مرد کا اور نہ ایماندار عورت کا جب کہ مقرر کردے اللہ اور اس کا رسول کوئی کام کہ ان کو رہے اختیار اپنے کام کا اور جس نے نافرمانی کی اللہ کی اور اسکے رسول کی سو وہ راہ بھولا صریح چوک کر۔

اس کے بعد انہوں نے سر تسلیم خم کرکے یہ رشتہ طے کر دیا مطلب یہ ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا حسن و جمال آپ ﷺ سے پوشیدہ نہیں تھا، باقی

Marfat.com

حضرت زید کا طلاق دینا اور آپ ﷺ کا شادی کرنا تو اس میں دینی مصلحت تھی جس کی ہم وضاحت کرتے ہیں۔

وضاحت: سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اس واقعہ میں آپ ﷺ کی مذمت کی گئی ہے اور نہ زجر توبیخ اور نہ ہی آپ کو عاصی یا خطاکار کہا گیا ہے، اور نہ ہی آپ ﷺ نے اپنی آپ کو گنہگار سمجھ کر اعتراف گناہ کرتے ہوئے استغفار و توبہ کی ہے۔ اگر اس واقعہ میں آپ ﷺ سے کوئی چھوٹی سی، معمولی بات بھی سرزد ہوتی تو اللہ رب العزت کی طرف متوجہ ہوتے اور توبہ پڑھتے جیسے دیگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے معمولی اور خلافِ اولیٰ بات صادر ہوئی تو انہوں نے توبہ و استغفار کی۔

اب آتے ہیں اس نکاح کی طرف۔ اس میں حکمت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت زید کو متبنیٰ یعنی منہ بولا بیٹا بنایا تھا اور عرب لوگ متبنیٰ کو بھی حقیقی بیٹے کی طرح سمجھتے تھے اور قوموں کا دستور یہ رہا ہے کہ والد کے بعد اس کی مسند اور تخت پر اس کا بیٹا جلوہ افروز ہوتا ہے۔ خاص طور پر سرداری اور بادشاہی نظام میں یہی دیکھا گیا ہے، لوگ بھی اس میں بیٹے کا ہی استحقاق جانتے ہیں یہاں یہ بات دکھائی تھی کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کا آپ ﷺ سے ابنیت یعنی حقیقی بیٹے کی طرح والا تعلق توڑا جائے تاکہ لوگوں میں دین اسلام کی ریاستہ، خلافت، سردرانہ اور بادشاہانہ طور طریقہ پر نہ رہے، لہٰذا ضروری تھا کہ ایسا عمل کیا جائے جس سے حضرت زید کی حقیقی ابنیت والا تصور نکل جائے، اس میں آپ ﷺ زبان سے کہہ دیتے کہ میرا بیٹا نہیں ہے اور بیٹے والی مراعات کا مستحق نہیں ہے تو لوگ مانتے لیکن ساتھ ہی ساتھ تاویل کا راستہ باقی رہتا کہ ہو سکتا آپ ﷺ نے کسی موقعہ پر ناراضگی کی وجہ سے یا کسی حکمت کی بناء پر یہ الفاظ فرمائے ہوں۔ جیسے معاشرے میں ہوا کرتا ہے کہ باپ غصہ میں یا کسی حکمت کی بنیاد پر اپنے بیٹے کو کہہ دیتا ہے کہ تو میرا بیٹا نہیں، میں تمہیں عاق کرتا ہوں، تو ایسے الفاظ سے اس کو ابنیت سے خارج نہیں سمجھا جاتا۔ اس لئے یہی ایک ایسا قطعی عمل تھا کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ اپنی بیوی کو طلاق دیدے اور عدت گذرنے کے

Marfat.com

بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے نکاح کر لیں تاکہ واضح ہو جائے کہ متبنیٰ، حقیقی بیٹا نہیں ہوتا ہے اور اس کی بیوی حقیقی بہو نہیں ہے، جبکہ حقیقی بہو سے نکاح کی حرمت اب بھی باقی ہے لہٰذا حضرت زید یا ان کی اولاد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان کی خلافت وغیرہ میں کوئی خصوصیت نہیں رکھتی، اور اس کے ساتھ دوسری حکمت یہ بھی تھی کہ جاہلیت والی رسم کا خاتمہ ہو جائے کہ لوگ منہ بولے بیٹے کی بیوی کو حقیقی بہو سمجھ کر اس سے نکاح کو ناجائز سمجھتے تھے۔

اب اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب اس مصلحت شرعیہ کو سمجھتے تو پھر امسک علیک زوجک اور اتق اللہ کہنے کا کیا مقصد ہے اور تخفی فی نفسک میں کونسی چیز کو چھپا رہے تھے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ نکاح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چاہت سے اپنی پھوپھی کے خاندان سے مانگ کر حضرت زید سے کروایا تھا، جس میں پہلے تو وہ راضی نہیں تھے بعد میں راضی ہوئے اور دل سے قبول کیا، لیکن حضرت زینب کا اعلیٰ خاندان سے ہونا اور حضرت زید پر غلامیت کا دھبہ یہ ایسی چیز تھی کہ زوجین کے درمیان مفاہمت پیدا نہ ہو سکی اور جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ یہ نکاح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مرضی سے کروایا تھا اسلئے حضرت زید طلاق دینے سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اعتماد میں لینا چاہتے تھے لہٰذا وقتاً فوقتاً ایسی بات کرتے تھے اور طلاق دینے کا ارادہ ظاہر کرتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم دل میں تو مصلحت شرعیہ کی وجہ سے چاہتے تھے کہ اچھا ہے کہ زید طلاق دیدے اور میں نکاح کر لوں، لیکن لوگ متبنیٰ کی بیوی کو حقیقی بہو سمجھتے ہیں، پھر یہ منافقین ایسا انتشار پھیلائیں گے کہ عام اور سادہ مسلمان غلط فہمی میں مبتلا ہو کر بے چین ہو جائیں گے، اسلئے فرماتے تھے، امسک یعنی طلاق نہ دیجئے۔

تفسیر خازن نے تخفی فی نفسک ما اللہ مبدیہ کی تفسیر حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہما سے اس طرح نقل کی ہے۔

فَاِنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ قَدْ اَعْلَمَہٗ اَنَّہَا سَتَکُوْنُ مِنْ اَزْوَاجِہٖ وَاَنَّ زَیْدًا سَیُطَلِّقُھَا فَلَمَّا جَآءَ زَیْدٌ قَالَ اِنِّیْ اُرِیْدُ اَنْ اُطَلِّقَھَا قَالَ لَہٗ اَمْسِکْ عَلَیْکَ زَوْجَکَ فَعَاتَبَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی وَقَالَ لِمَ

Marfat.com

قُلْتَ اَمْسِكْ زَوْجَكَ وَقَدْ اَعْلَمْتُكَ اَنَّهَا سَتَكُوْنُ مِنْ اَزْوَاجِكَ وَهٰذَا هُوَ الْاَوْلٰى وَالْاَلْيَقُ بِحَالِ الْاَنْبِيَاءِ۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے، آپ ﷺ کو حضرت زید کے آنے سے پہلے معلوم کروایا کہ حضرت زینب آپ کی ازواج میں شامل ہونگی اور عنقریب حضرت زید انہیں طلاق دیدینگے پھر جب حضرت زید آئے اور انہوں نے کہا کہ میں زینب کو طلاق دینا چاہتا ہوں تو آپ ﷺ نے انہیں روکا اسی پر اللہ تعالیٰ نے عتاب دیا کہ جب میں نے آپکو معلوم کروایا کہ یہ آپ کی ازواج میں شامل ہونگی پھر کیوں کہا اَمْسِكْ، اور یہی زیادہ بہتر ہے اور انبیاء علیہم السلام کے حالات کے لائق بھی یہی ہے۔

اَنَّمَا عُوْتِبَ عَلٰى اِخْفَاءِ مَا اَعْلَمَهُ اللهُ اَنَّهَا سَتَكُوْنُ زَوْجَتَهُ وَاَنَّمَا اَخْفٰى ذٰلِكَ اِسْتِحْيَاءً اَنْ يُّخْبِرَ زَيْدًا اَنَّ الَّتِىْ تَحْتَكَ وَفِىْ نِكَاحِكَ سَتَكُوْنُ زَوْجَتِىْ وَهٰذَا قَوْلٌ حَسَنٌ مَرْضِىٌّ وَكَمْ مِنْ شَىْءٍ يَتَحَفَّظُ الْاِنْسَانُ وَيَسْتَحِىْ مِنْ اِطِّلَاعِ النَّاسِ عَلَيْهِ وَهُوَ فِىْ نَفْسِهٖ مُبَاحٌ مُتَّسِعٌ وَحَلَالٌ مُطْلَقٌ لَا مَقَالَ فِيْهِ وَلَا عَيْبَ عِنْدَ اللهِ۔ (خازن ج ۳ ص ۵۰۲)

جو بات آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے معلوم کروائی کہ یہ (زینب) عنقریب آپکی بیوی ہونے والی ہے اسکو چھپانے پر آپ ﷺ کو عتاب دیا گیا اور آپ ﷺ کا اس بات کو چھپانا آپ کے (طبعی) حیاء کی وجہ سے تھا، کہ (کیسے) زید کو خبر دوں کہ جو آپ کی بیوی ہے وہ عنقریب میری بیوی ہو جائیگی۔ یہی قول بہتر اور قابل پسند ہے، بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ آدمی ان پر لوگوں کے مطلع ہونے سے شرماتا ہے حیاء کرتا ہے حالانکہ وہ فی نفسہٖ مباح اور قابل وسعت اور مطلق حلال ہوتی ہیں، اس میں کوئی بات نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی عیب نہیں۔

ابن کثیر نے یہ الفاظ بیان کیئے ہیں

وَلٰكِنَّ اللهَ تَعَالٰى اَعْلَمَ نَبِيَّهٗ اَنَّهَا سَتَكُوْنُ مِنْ اَزْوَاجِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّتَزَوَّجَهَا، فَلَمَّا اَتَاهُ زَيْدٌ رَضِىَ اللهُ عَنْهُ يَشْكُوْهَا اِلَيْهِ قَالَ اِتَّقِ اللهَ وَاَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ فَقَالَ قَدْ اَخْبَرْتُكَ

Marfat.com

اِنِّیْ مُتَزَوِّجُکَھَا وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِکَ مَا اللّٰہُ مُبْدِیْہِ۔ (ابن کثیر ج ۳ ص ۶۴۳ مطبع قدیمی کراچی)

یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو پہلے ہی بتلا دیا تھا کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا بھی آپ کی ازداج مطہرات میں داخل ہو جائے گی۔ پھر جب حضرت زید رضی اللہ عنہ انکی شکایت لے کر آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا اللہ سے ڈر اور اپنی بیوی کو طلاق نہ دے تو اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے تو آپ کو بتلا دیا تھا کہ میں اس سے آپ کا نکاح کروا دونگا اور آپ اپنے دل میں اس چیز کو چھپاتے رہے جس کو اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے۔

ایک دوسرا اشکال یہ ہوتا ہے کہ منافقین کے طعن و تشنیع سے بچنے کے لئے رسول اللہ ﷺ نے اس معاملہ کا اخفاء کیوں فرمایا جو سبب عتاب ہوا۔

اس کا جواب حضرت مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ اس طرح لکھتے ہیں:

اس معاملہ میں اصل ضابطہ جو قرآن و سنت سے ثابت ہے یہ ہے کہ جس کام کو کرنے سے لوگوں میں غلط فہمی پیدا ہونے اور ان کے طعن و تشنیع میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو تو لوگوں کے دین کی حفاظت اور ان کو طعن و تشنیع کے گناہ سے بچنے کے نیت سے چھوڑ دینا اس صورت میں تو جائز ہے جب کہ یہ فعل خود مقاصد شرعیہ میں سے نہ ہو، اور کوئی دینی حکم حلال اور حرام کا اس سے متعلق نہ ہو اگرچہ فعل فی نفسہٖ محمود ہو جیسے جاہلیت کے زمانہ میں کفار نے بیت اللہ کی تعمیر میں کچھ چیزیں بناءِ ابراہیمی کے خلاف کر دی تھیں اور جب مکہ کی فتح ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر نو مسلم لوگوں کے غلط فہمی میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ نہ ہوتا تو میں بیت اللہ کو پھر بناءِ ابراہیمی کے مطابق بنا دیتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو غلط فہمی سے بچانے کے لئے اپنا یہ ارادہ جو شرعاً محمود بھی تھا اس کو ترک کر دیا اور منجانب اللہ اس پر کوئی عتاب بھی نہیں ہوا کیونکہ بیت اللہ کو بناء ابراہیمی کے مطابق دوبارہ بنانا ایسا عمل نہیں تھا جس پر کوئی شرعی مقصد موقوف ہو یا حلال و حرام کے متعلق ہو۔

بخلاف واقعہ زینب رضی اللہ عنہا کے کہ اس سے ایک مقصد شرعی متعلق تھا کہ

Marfat.com

جاہلیت کی رسم بد اور اس خیال باطل کی عملی تردید ہو جائے کہ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے نکاح حرام ہے، کیونکہ قوموں میں چلی ہوئی غلط رسموں کو توڑنا عملاً جب ہی ممکن ہوتا ہے جب اسکا عملی مظاہرہ ہو، حکم ربانی اسی کی تکمیل کے لئے حضرت زینب کے نکاح سے متعلق ہوا۔

تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس حکم کی قولی تبلیغ جو سورۃ احزاب کی پہلی آیات میں آچکی ہے اس کو کافی سمجھا اور اس کے عملی مظاہرہ کی حکمت کی طرف (آپکی) نظر نہیں گئی، اس لئے باوجود علم وارادہ کے اس کو چھپایا۔ (معارف القرآن)

گیارہوں بحث: آپ ﷺ کا لوگوں سے ڈرنا

اور اسی سورہ کی آیت ۳۹ میں فرمایا اَلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسَالَاتِ اللهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللهَ۔ یعنی تمام انبیاء علیہم السلام کی شان یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے نہیں ڈرتے، اور آپ ﷺ کا خود فرمان ہے۔ اَنَا اَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَاَتْقَاكُمْ لَهٗ۔ یعنی تم لوگوں کی بنسبت میں ہی اللہ تعالیٰ سے زیادہ خشیت اور تقویٰ اختیار کرنے والا ہوں۔

اسکے باوجود اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ یعنی آپ ﷺ لوگوں سے ڈرتے ہیں، لائق تو یہ تھا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے۔ اس کا کیا مطلب؟

وضاحت: اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ ابلاغ رسالت میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام لوگوں سے ڈر کر کسی قسم کی کوتاہی بلکل نہیں کرتے اور آپ ﷺ نے بھی اداء رسالت میں کسی قسم کا ڈر اختیار نہیں کیا، یہاں تخشی الناس میں جس ڈر کا ذکر ہے اس کا بظاہر تعلق دنیوی مصلحت سے سمجھا، لیکن آپ ﷺ پر جب یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ نکاح بھی ایک عملی تبلیغ ورسالت کا ایک جز ہے تو اس کے بعد آپ ﷺ کو کسی کا خوف طعن و تشنیع مانع عمل نہیں ہوا اور یہ نکاح عمل میں لایا گیا اگرچہ کفار و منافقین اعتراضات کرتے رہے۔

حضرت علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ اس کا جواب یوں بیان فرماتے ہیں۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شان میں فرمایا اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰہِ وَیَخْشَوْنَہٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہ۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے لیکن اس جگہ جب لوگوں سے ڈرنے کا ذکر کیا تو (بطور عموم ضابطہ) یہ بھی فرمادیا کہ تمام امور واحوال میں خدا سے ڈرنا ہی سزاوار ہے، میں کہتا ہوں اس تشریح پر آیت کا مطلب اس طرح ہوا۔ آپ لوگوں کے طعن سے ڈرتے ہیں اور جتنا لوگوں سے ڈرتے ہیں اس سے زیادہ خدا کا خوف رکھتے ہیں کیونکہ اللہ ہی سے ڈرنا سزاوار ہے، پس لوگوں کے ڈر اور خوف سے آپ نے دل میں ایک بات چھپالی اور اللہ کے خوف سے (حضرت زید کو) نیکی اور بھلائی کا حکم بھی دیا اور حکم خدا کی تعمیل میں کوئی کمی نہیں کی، یہ ہی مطلب ہے آیت لایخشون احداً الا اللہ کا کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام لوگوں کا خوف ولحاظ ایسا نہیں رکھتے کہ اس کی وجہ سے اللہ کے حکم کی تعمیل چھوڑ دیں یا اس میں کمی کر دیں۔ رہا عام طور پر لوگوں سے ڈرنا اور ان کے طعن کا لحاظ رکھنا تو بات بری نہیں بلکہ اچھی ہے۔ حیاء تو ایمان کا جز ہے۔

(استفادہ: تفسیر خازن، تفسیر مظہری، تفسیر ابن کثیر، تفسیر معارف القرآن، تفسیر سہل البیان)

بارہویں بحث: کیا انبیاء علیہم السلام سے شرک صادر ہو سکتا؟

وَلَقَدْ اُوْحِیَ اِلَیْکَ وَاِلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکَ ۚ لَئِنْ اَشْرَکْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُکَ وَلَتَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ (سورہ زمر آیت ۶۵)

اور تحقیق وحی کی گئی آپ کی طرف اور جو پیغمبر آپ سے پہلے گزرے ہیں انکی طرف (بھی) وحی کی گئی کہ اگر تم نے شرک کیا تو ضرور تمہارے اعمال برباد ہو جائیں گے اور تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوں گے۔

بحث: یہ تنبیہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان سے پہلے تمام انبیاء علیہم السلام کو کی جاتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء علیہم السلام سے شرک صادر ہونا ممکن نہ ہوتا تو اس طرح کا خطاب نہ ہوتا۔

Marfat.com

وضاحت: توجیہ ۱: یہ خطاب ہر پیغمبر کی وساطت سے ان کی امت کے ہر فرد کو ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام سے تو شرک کا صادر ہونا ممکن ہی نہیں کیونکہ اللہ رب العزت نے تمام انبیاء علیہم السلام کو معصوم کیا ہے لہٰذا آیات کا ترجمہ اس طرح ہے۔

آپ کی طرف اور جو پیغمبر آپ سے پہلے ہو گذرے ہیں ان کی طرف بھی یہ وحی بھیجی جا چکی ہے کہ (ہر اُمتی کو پہنچادیں) کہ اگر تو شرک کریگا تو تیرا کیا کرایا کام سب غارت ہو جائے گا اور تو خسارے میں پڑے گا۔ (حضرت تھانوی)

شرکت کے خطاب میں عام لوگ ہیں، نہ کی انبیاء علیہم السلام یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم۔

توجیہ ۲: یہ خطاب تو نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن پھر بھی مراد اس سے امت کا ہر فرد ہے۔

وھذا خطاب مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والمراد بہ غیرہ لِاَنَّ اللہ عزوجل عصم نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم من الشرك وفيه تهديد لغيره۔ (خازن ج ۴ ص ۶۶)

اور یہ خطاب گرچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا گیا ہے لیکن مقصود دوسرے لوگ ہیں کیونکہ اللہ رب العزت نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شرک سے معصوم رکھا ہے اور اس سے دوسروں کو تنبیہ ہے۔

قرآن کریم میں اسی طرح کا خطاب متعدد آیات میں کیا گیا ہے جس سے خطاب بظاہر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن مقصود امت کے افراد ہیں۔ جیسے فرمایا گیا۔

يَاۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ (سورۃ الطلاق)

ﮦ اے نبی جب تم طلاق دو عورتوں کو تو انکو طلاق دو انکی عدت پر اور گنتے رہو عدت کو۔

اس آیت میں یاایہا النبی کے لفظ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب بنا کر پوری امت کو خطاب کیا گیا ہے۔ ایسا ہی ہم سورہ یونس کی آیت نمبر ۹۴ کی بحث میں توجیہ نمبر ۵ میں بیان کر چکے ہیں۔

توجیہ ۳: یہ کلام جلالی انداز میں شہنشاہی رعب کے قاعدہ پر مشتمل ہے، شرک

Marfat.com

کی نحوست اور گندگی ایسی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے نیک بندے بلکہ مقرب اور پیغمبر کے درجہ کے آدمی بھی شرک کر بیٹھیں تو ان کے بھی نیک اعمال سارے کے سارے غارت ہو جائیں گے، وہ بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہ بچ سکیں گے ان کو بھی وہی سزا ملے گی جو دوسرے مشرکین کو ملے گی۔

توجیہ ۴: یہ کلام بفرضِ محال کے اعتبار سے کیا گیا ہے، جیسا کہ فرمایا لوکان فیھما الھۃ الا اللہ لفسدتا۔

یعنی اگر ان دونوں (آسمان و زمین) میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو دونوں تباہ و برباد ہو جاتے۔

یعنی اُمت کو شرک کے قبح پر مطلع کرنا مقصود ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے شرکیہ عمل تو ممکن نہیں ہے اگر بفرض محال ان سے شرکیہ عمل ہو جاتا تو وہ بھی خسارہ میں پڑ جاتے۔

تیرہویں بحث: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان کے متعلق

مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْإِيمَانُ۔ (سورہ شوریٰ آیت ۵۲)

ترجمہ: آپ کو نہ یہ خبر تھی کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ خبر تھی کہ ایمان کیا ہے؟

بحث: اللہ تعالیٰ جس انسان کو اپنا رسول یا نبی بناتے ہیں تو اسکو ابتدا ہی سے ایمان پر پیدا فرماتے ہیں، ان کی فطرت ایمان پر مبنی ہوتی ہے وہ تو عطائے نبوت سے پہلے بھی مومن ہوتے ہیں، لیکن درج بالا آیت میں بتایا جاتا ہے کہ ہماری وحی سے پہلے نہ آپ قرآن کریم کو جانتے تھے اور نہ ہی ایمان کو جانتے تھے۔

وضاحت: توجیہ ۱: اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام پیدائشی پکے مومن ہوتے ہیں، ان کا بچپن بھی شرک و کفر کے اعمال سے پاک ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے جب ان کی قوموں نے مخالفت کی تو ان پر طرح طرح کے الزام لگائے مگر کسی پیغمبر پر کسی امت نے یہ الزام نہیں لگایا کہ تم بھی تو نبوت کے دعوے سے پہلے ہماری طرح بتوں کی پرستش کرتے تھے تو آیت کا مطلب یہ ہو گا۔

Marfat.com

ماکنت تدری قبل الوحی شرائع الایمان ومعالمہ۔ (خازن ج ۴ ص ۱۰۸)

یعنی وحی سے پہلے آپ ﷺ ایمان کے شرائع وعلامات (تفصیلی سے) واقف نہیں تھے (جن کو جاننے کا طریقہ عقلی نہیں بلکہ محض نقلی ہے، وحی کے ذریعہ ہے) مطلب یہ ہے آپ ﷺ وحی سے پہلے ایمان کی تفصیلی حقیقت سے باخبر نہیں تھے۔

توجیہ ۲: وقال محمد بن اسحٰق عن ابن خزیمۃ اِلایمَانُ فی ھذا الموضع الصلاۃ دَلِیۡلُہٗ وَمَاکَانَ اللہُ لِیُضِیۡعَ اِیۡمَانَکُمۡ یعنی صلاتکُمۡ وَلَمۡ یُرِدۡ بِہِ الایمانُ الذی ھُوالاقرارُ باللہِ تعالیٰ لِاَنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَانَ قبل النبوۃ یوحد اللہ تعالیٰ ویَحُجُّ وَیَعۡتَمِرُ ویُبۡغِضُ اللات والعزیٰ وَالا یَاۡکُلُ ما ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ وَکَانَ یتعبد علیٰ دین ابراھیم علیہ الصلوٰۃ والسلام ولم تَتَبَیَّنۡ لَہٗ شَرَائِعَ دینہٖ اِلاَّ بعد الوحی اِلَیۡہِ۔ (خازن ج ۴ ص ۱۰۸)

محمد بن اسحاق نے ابن خزیمہ سے روایت کی ہے کہ اس جگہ ایمان سے مراد نماز ہے، جیسے ماکان اللہ لیُضیع ایمانکم میں فرمایا، کہ اللہ تعالیٰ ایسا نہیں ہے جو تمہاری نمازوں کو اکارت کرے، تو یہاں ایمان سے اقرار باللہ (توحید ربانی) مراد نہیں ہے کیونکہ آپ ﷺ تو نبوت سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ کی توحید کو مانتے تھے اور حج وعمرہ بھی کرتے تھے نیز لات وعزیٰ سے نفرت رکھتے تھے اور وہ چیزیں نہیں کھایا کرتے جو بت پرستی کے آستانوں پر ذبح کی جاتی تھیں۔

آپ ﷺ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دین (حنیف) کے مطابق بندگی کیا کرتے تھے اور آپ ﷺ کے لئے اپنے دین کے احکام تو وحی کے بعد ہی بیان ہوئے ہیں۔

چودھویں بحث: کیا آپ ﷺ توحید کے معاملہ میں متردد تھے؟

فاعلم انّہٗ لآالٰہ اِلاَّ اللہُ۔ (سورۃ محمد آیت ۱۹)

ترجمہ: سو تو جان لے کہ کسی کی بندگی نہیں سوا اللہ کے۔

بحث: اس آیت میں آپ ﷺ کو عقیدہ توحید کی تعلیم دی جارہی ہے تو کیا اس سے پہلے تک آپ توحید کے عقیدہ میں متردد تھے؟

Marfat.com

وضاحت: توجیہ ۱: آپ ﷺ عقیدہ توحید کو اچھی طرح جانتے تھے اس پر احسن طریقے سے عمل کرنے والے تھے، یہاں خطاب آپ سے کیا گیا ہے لیکن اس خطاب سے آپ کی امت کو یہ تعلیم دینا مقصود ہے کہ آپ یقین کرلیں کہ قیامت ہو کر رہے گی تمام سلطنتیں باطل ہو جائیں گی کسی کی بادشاہی نہیں رہے گی، کوئی راہ نجات نہیں ہو گی سوائے ایک اللہ کے۔

توجیہ ۲: مَعْنَاهُ دُمْ عَلٰی مَا اَنْتَ عَلَیْهِ مِنَ الْعِلْمِ فَهُوَ کَقَوْلِ الْقَائِلِ لِلْجَالِسِ اِجْلِسْ اَیْ دُمْ عَلٰی مَا اَنْتَ عَلَیْهِ مِنَ الْجُلُوسِ۔ (تفسیر خازن ج ۴ ص ۱۴۸)

یعنی اسکی معنی ہے کہ آپ کو جو علم ہے اسی پر مداومت کے ساتھ قائم رہئے جیسا کہ بیٹھے ہوئے آدمی کو کہا جاتا ہے کہ آپ بیٹھیں تو اس سے بھی یہی مقصود ہوتا ہے کہ آپ اپنے بیٹھنے والے عمل پر دائم رہئے۔

پندرہویں بحث: آپ ﷺ کو استغفار کے حکم کے متعلق

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِکَ۔ الآیۃ (سورہ محمد آیت ۱۹)

ترجمہ: اور آپ اپنے گناہ کیلئے استغفار کریں۔

واستغفرہُ اِنَّهٗ کان توّاباً۔ (سورہ النصر آیت ۳)

ترجمہ: اور بخشش طلب کیجئے اس سے بیشک وہ معاف کرنیوالا ہے۔

لیغفر لك اللہ ماتقدم من ذنبك وَمَا تَاَخَّرَ۔ (سورہ فتح آیت ۲)

ترجمہ: تاکہ اللہ آپ کی سب اگلی پچھلی فروگزاشتیں معاف فرمادے۔

(ترجمہ از تفسیر مظہری)

بحث: ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ سے گناہ صادر ہوئے تھے۔ اس لئے استغفار کا حکم دیا گیا۔

وضاحت: نہیں! یہ بات مسلم ہے کہ آپ ﷺ یقیناً تمام ذنوب وعصیان سے معصوم تھے، باقی جو سورہ محمد اور سورۃ النصر میں استغفار کا حکم آیا ہے تو علماء کرام نے اس کی مختلف توجیہات بیان کی ہیں، جن میں سے کچھ یہاں ذکر کرتے ہیں۔

Marfat.com

وضاحت: توجیہ ا: یہ مقام عبدیت کی شان ہے کہ عبد یعنی بندہ کتنا ہی اعلیٰ و افضل مقام کا ہو اور ذنوب و عصیان سے صاف ہو اور بندگی و اطاعت میں صف اول میں عالی مرتبت کا ہو لیکن خالق کے سامنے مخلوق ہونے کے لحاظ سے معبود کے سامنے عبدیت کا اظہار اس طرح ہے کہ لا اُحصِی ثَنَاءً عَلَیْكَ یعنی میری کیا مجال ہے کہ تیری ثنا کا حق اس انداز سے ادا کرسکوں جیسے کرنا چاہیے بس اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِكَ اور مَاعَبَدنَاكَ حَق عِبَادَتِكَ۔

یعنی اے میرے پروردگار میری کیا مجال ہے کہ میں آپ کی حمد وثنا کا حق اس انداز سے کرسکوں جیسے کرنا چاہئے اور میری کیا مجال ہے کہ میں تیری بندگی کا حق ادا کرسکوں۔ لہٰذا میری عاجزی تیری حضور میں ہے سُبْحَانَكَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ۔ یہی کلمات آپ ﷺ سورہ النصر کے نزول کے بعد کثرت سے پڑھا کرتے تھے۔

توجیہ ۲: آپ ﷺ نے فرمایا انهٗ لیغان علی قلبی حتیٰ استغفر فی الیوم مائة مرة۔ وفی روایة قال توبوا الی ربکم فَوَاللّٰہِ اِنِّی لَاَتُوْبُ اِلٰی رَبِّی عزوجل مائة مرة فی الیوم۔

یعنی میرے دل پر بھی حجاب آجاتا ہے یہاں تک کہ میں روزانہ سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں، ایک روایت میں ہے فرمایا تم لوگ بھی اپنے رب کے حضور میں توبہ کرو اللہ کی قسم میں روزانہ اپنے رب کے حضور میں سو مرتبہ توبہ کرتا ہوں، یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ آپ کے دل مبارک پر حجاب کا آجانا اس طرح ہرگز نہیں جس طرح ہمارے دل سیاہ ہوجاتے ہیں۔

توجیہ ۳: یعنی اس (جہادی) عظیم کام کے سرانجام دینے پر ممکن ہے بشری تقاضا سے ذہول ونسیان ہوا ہو۔ یا اس کام میں لگنے کی وجہ سے اور خلق میں مشغول ہونے کی وجہ سے مشغولیت حق کے انہماک سے جو فرق پڑا ہے گرچہ وہ بھی تعمیل ارشاد کی حیثیت سے مشغولیت حق بھی ہے تاہم کچھ نہ کچھ اس سے طبیعت میں تکدر پیدا ہوا اس تکدر کو دور کرنے کیلئے استغفار تھی۔

Marfat.com

توجیہ ۴: اَنَّ ذَنْبَ الْاَنْبِیَاءِ تَرْکُ الْاَفْضَلِ دُوْنَ مُبَاشَرَۃِ الْقَبِیْحِ وَذُنُوْبُنَا مُبَاشَرَۃُ الْقَبَائِحِ مِنَ الصَّغَائِرِ وَالْکَبَائِرِ۔ (تفسیر مدارک التنزیل علی ہوامش الخازن ج ۴ ص ۱۴۸)

یعنی انبیاء علیہم السلام کے گناہ کسی افضل عمل کو چھوڑنا ہوتا ہے، ان کا گناہ اس طرح نہیں ہوتا جیسے ہم چھوٹے بڑے گناہوں کی گندگی میں ملوث ہو جاتے ہیں۔

توجیہ ۵: فیہ تنبیہ علی ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم مع عصمتہ وشدۃ اجتہادہ ماکان یستغنی عن الاستغفار فکیف بمن ھو دونہ۔ (خازن ج ۴ ص ۴۵۵)

یعنی اس میں امت کو تنبیہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم باوجود معصوم ہونے کے اور عبادت وریاضت میں سختی سے اہتمام کرنے کے باوجود استغفار پڑھنے سے مستغنی نہیں ہیں تو ہم اور آپ کا کیا حال ہوگا؟ یعنی ہم لوگ بطریق اولیٰ استغفار پڑھنے کے حقدار ہیں۔ (استفادہ: خازن، مدارک التنزیل، کمالین علیٰ جلالین، مظہری)

رہی بات سورہ فتح کی آیت ۲ کی تو اس کو بھی مندرجہ بالا توجیہات کی نظر سے دیکھا جائے، تاہم اس آیت کی کچھ توجیہات اور بھی بیان کی جاتی ہیں۔

توجیہ ۶: حضرت شیخ القرآن رحمۃ اللہ علیہ روح المعانی کے حوالے سے نقل فرماتے ہیں والمراد بالذنب مافرط من خلاف الاولیٰ بالنسبۃ الیٰ مقامہ علیہ الصلوٰۃ والسلام فھو من قبیل حسنات الابرار سیئات المقربین وقد یقال المراد ماھو ذنب فی نظرہ العالی صلی اللہ علیہ وسلم وان لم یکن ذنبا ولا خلاف الاولیٰ عندہ تعالیٰ (روح المعانی)

یعنی ذنب سے گناہ مراد نہیں ہے بلکہ ترک اولیٰ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عالی مقام کے اعتبار سے ذنب (کہا جاتا) ہے پس یہ از قبیل حسنات الابرار وسیئات المقربین ہے، اور یوں بھی کہا جاتا ہے کہ وہ امور مراد ہیں جنہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نظروں میں گناہ (ذنب) سمجھتے تھے اگرچہ وہ حقیقت میں گناہ نہ تھے بلکہ خلاف اولیٰ بھی نہ تھے۔

توجیہ ۷: حضرت شیخ القرآن رحمۃ اللہ علیہ مزید فرماتے ہیں کہ حضرت انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ذنب سے مراد الزام ہیں، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر لگائے گئے مشرکین ومنافقین کے تمام جھوٹے الزامات سے بری اور پاک فرمائے،

Marfat.com

لیغفر میں لام ارادہ کا ہے اور اس کے بعد فعل اَرَادَ اور اَنْ مصدریہ مقدر ہے ای اَرَادَ غُفْرَانَ ذُنُوبَكَ۔ (یعنی آپ پر جو جھوٹے الزامات لگائے گئے ہیں ان سے آپ کو بری کرے (بحوالہ جواہر القرآن ج ۳ ص ۱۱۴۹)

توجیہ ۸: وقال سفیان الثوری مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ مِمَّا كَانَ مِنْكَ قَبْلَ النُّبُوَّةِ وَمَا تَاَخَّرَ يَعْنِي كُلُّ شَيْءٍ لَمْ تَعْمَلْهُ وَيُذْكَرُ مِثْلُ هٰذَا عَلٰى طَرِيقِ التَّاكِيدِ كَمَا تَقُولُ اَعْطِ مَنْ تَرَاهُ وَمَنْ لَمْ تَرَهُ وَاضْرِبْ مَنْ لَقِيتَ وَمَنْ لَمْ تَلْقَهُ۔ (خازن ج ۴ ص ۱۵۵)

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ماتقدم من ذنبک سے نبوت سے پہلے (والے حالات، زلات) مراد ہیں اور ماتاخر سے وہ چیز مراد ہیں جو آپ ﷺ نے نہیں کی یہ مثال بطریق تاکید کے ہے، جیسے (محاورہ کے اعتبار سے) آپ کسی کو کہہ دیں اس کو بھی دے دیجئے جس کو آپ دیکھیں اور اس کو بھی دے دیں، جسے آپ نہ دیکھیں، اس کو بھی مار دیجئے جس سے آپکی ملاقات ہو اور اس کو بھی مار دیجئے جسے آپ نہ ملیں۔

سولھویں بحث: آپ ﷺ کا حلال کو حرام کرنا

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ۔ اے نبی تو کیوں حرام کرتا ہے جو حلال کیا اللہ نے تجھ پر۔ (سورۃ التحریم)

بحث: طرز خطاب سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریم ناجائز ہے، لہٰذا آپ ﷺ نے حلال کو حرام کیوں کیا؟

وضاحت: ہر حلال کو حرام کرنا گناہ نہیں ہے۔ جیسے طلاق و عتاق میں حلال کو طلاق کے ذریعہ حرام کیا جاتا ہے۔ آیت میں جس فعل کا ذکر ہے ایسا فعل جب کسی ضرورت و مصلحت سے (عارضی طور پر) ہو تو جائز ہے گناہ نہیں مگر اس واقعہ میں ضرورت ایسی نہ تھی کہ اس کی وجہ سے آپ ﷺ خود کوئی تکلیف اٹھادیں اور ایک حلال چیز کو چھوڑ دیں کیونکہ آپ ﷺ کا یہ کام ازواج مطہرات کو خوش کرنے کیلئے تھا

Marfat.com

اور ایسے معاملے میں ان کا راضی کرنا آپ کے ذمہ لازم نہ تھا اسلئے اللہ تعالیٰ نے ازروئے شفقت و عنایت یہ کلام فرمایا، بظاہر کلام کی صورت جواب طلبی کی تھی جس سے یہ خیال ہوسکتا تھا کہ شاید آپ سے کوئی بڑی غلطی ہوگئی اسلئے ساتھ ہی واللہ غفور رحیم فرما کر تسلی دیدی۔ (استفادہ: معارف القرآن و عصمت انبیاء)

سترہویں بحث: آپ ﷺ نے منہ میں تیوری چڑہائی

عَبَسَ وَتَوَلّٰی اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی۔ (سورہ عبس آیت ۱، ۲)

ترجمہ: تیوری چڑہائی اور منہ موڑا اس بات سے کہ آیا اسکے پاس نابینا۔

بحث: آپ ﷺ نے کفار صنادید قریش کی خاطر عبد اللہ بن ام مکتوم سے روگردانی کی، یہ روگردانی کرنا، اچھا عمل نہ تھا جب ہی اللہ تعالیٰ نے عتاب نازل کیا۔

وضاحت: آپ ﷺ کا حضرت عبد اللہ سے یہ منہ موڑنا، گناہ کا عمل نہ تھا اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کیلئے خُلقِ عظیم کے مرتبہ پر فائز ہونے کی خود گواہی دی ہے، اس آیت کے اندر خطاب کرے ضمائر کو چھوڑ کر غائب کے ضمائر سے آنحضرت ﷺ کو کیا یہ سے کلام کیا گیا ہے، اس میں آپ ﷺ کی عزت و تکریم کی طرف لطیف اشارہ ہے، اس نابینا صحابی کے اعراض میں بھی رضائے الٰہی کا جذبہ مضمر تھا، تمام اعمال کا مدار نیت پر ہے، آپ ﷺ کا یہ اعراض کبر و نفرت کی وجہ سے تو نہ تھا، نہ ہی ان کی تذلیل مقصود تھی، ویسے بھی یہ نابینا صحابی قریش خاندان کے بنو مخزوم قبیلہ کا آپ ﷺ کا نسبتی برادر تھا کیونکہ وہ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا پھوپھی زاد یا خالہ زاد بھائی بھی تھا، آپ کا مقصد یہ تھا کہ یہ نابینا تو مخلص مؤمن ہے اس سے ذرا ٹھہر کر بھی پڑھایا جاسکتا ہے لیکن رؤساءِ قریش کو شاید اس طرح سمجھانے کا موقعہ پھر نہ مل سکے، نیز اگر وہ سمجھ گئے تو ان کی وجہ سے ہزاروں لوگ مسلمان ہوجائیں گے، اسلام کا دائرہ وسیع ہوجائے گا، اسکے علاوہ وما یدریک لعلہ یزکی میں عدم علم کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف صریحی تخاطب کے ساتھ بتارہی ہے کہ آپ

Marfat.com

صلی اللہ علیہ وسلم سے جو فعل سرزد ہو گیا اس میں آپ معذور تھے، لہٰذا معذوری بھی گناہ نہیں ہے۔ (استفادہ: کمالین علی جلالین، مظہری، جواہر القرآن، عصمت انبیاء)

اٹھارہویں بحث: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ضال کا لفظ

وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ۔ (سورہ الضحیٰ آیت ۷)

ترجمہ: اور اس نے تمہیں حیران پایا پھر تمہاری رہنمائی کی۔ (ترجمہ تفسیر حقانی سے)

بحث: ضلال کی معنی گمراہی اور شریعت سے پھر جانا آتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے ضلال کا لفظ کیسا ہے؟

وضاحت: ضلال کے کئی معنی آتے ہیں، گمراہی کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے، حیران ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے کھو جانے کے معنی بھی آتے ہیں، ضل الماء فی اللبن یعنی دودھ میں پانی گم ہو گیا اور غفلت کے معنی میں بھی آتا ہے۔ لَا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنسَى۔ (طٰہٰ آیت ۵۲) یعنی نہ میرا رب غافل ہوتا ہے نہ ہی بھولتا ہے، اور ضالّ کے معنی بے خبر ہونا بھی ہے۔ (اس لفظ کی لغوی تحقیق ہم پیچھے کر چکے ہیں تاہم یہاں بھی کچھ توجیہات بیان کرتے ہیں۔)

توجیہ ا: ووجدك ضالا عن معالم النبوة واحكام الشريعة فهداك اليها۔

(خازن، ج ۴ ص ۴۱۵)

یعنی آپ کو علامات نبوت واحکام شریعت سے بے خبر پایا پس (وحی کے ذریعہ) آپ کی اس طرف رہنمائی کی۔

یعنی وحی سے پہلے آپ دین و ایمان کی تفصیلات اور شریعت کے فروعی مسائل سے بے خبر تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم عبادت تو کرتے تھے، نماز تو پڑھتے تھے، لیکن ان کے تفصیل سے بے خبر تھے، نجاست سے دور رہتے تھے لیکن وضو اور غسل کے دستور کو نہ جانتے تھے، خیرات کرتے تھے، لوگوں کا مالی تعاون کرتے تھے لیکن زکوٰۃ کی تفصیل اور اسکے مصارف کو نہ جانتے تھے فھداک کا مطلب ہے کہ وحی کے ذریعہ ایسی تمام چیزوں سے آپکو ہم نے خبر دی۔

Marfat.com

توجیہ ۲: ووجدك ضالا نفسك لا تدری من انت فعرفك نفسك وحالك۔
(خازن ج ۴ ص ۴۱۵)

یعنی آپ اپنے متعلق نہ جانتے تھے کہ میرا منصب کیا ہے تو آپ کو ہم نے معرفت دی کہ آپ سید الرسل وخاتم الانبیاء ہیں آپ کا تعلق خالق کائنات سے قاب قوسین اور ادنیٰ والا ہے۔

توجیہ ۳: وقیل الضلال هنا بمعنی الحیرة۔۔۔ وقال الجنید ووجدك مُتَحیّراً فی بیان ما انزل الله الیك فهداك لبیانه۔ (خازن ج ۴ ص ۴۱۵)

کہا گیا ہے کہ ضلال کے معنی حیران ہونا ہے، حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ آپ کو مُنَزَّلُ من اللہ میں حیران پایا کہ اسکو میں کس طرح ادا کروں کس طرح بیان کروں تو آپکی اسمیں رہنمائی کی۔

توجیہ ۴: صوفیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپکو عاشق محب پایا تمہارا عشق حد سے آگے بڑھ چکا تھا، جذب کی حالت کو ضلال بطور کنایہ کہا جاسکتا ہے۔ (مظہری)

توجیہ ۵: وقال ابن عباس رضی الله عنه اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ ضَلَّ فِی شِعَابِ مَكَّةَ وَهُوَ صَبِیٌّ صَغِیْرٌ رَاٰهُ اَبُوْجَهْلٍ مُنْصَرِفاً مِنْ اَغْنَامِهٖ فَرَدَّهٗ اِلٰی جَدِّهٖ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ۔
(خازن ج ۴ ص ۴۱۵)

یعنی آپ ﷺ اپنے بچپن میں مکہ مکرمہ کی گلیوں میں گم ہو گئے، پھر ابو جہل نے آپ کو اپنی بکریوں سے بچھڑا ہوا دیکھا تو آپکے دادا عبد المطلب تک پہنچا دیا تھا۔

توجیہ ۶: وقال سعید ابن المسیب خرج رسول الله ﷺ مع عمه ابی طالب فی قافلة میسرة غلام خدیجه فبینما هو راکب ذات لیلة مظلمة اذا جاء ابلیس فاخذ بزمام ناقته فعدل به عن الطریق فجاء جبریل علیه السلام فنفخ ابلیس نفخة وقع منها الی الحبشه ورد رسول الله ﷺ الی القافلة فمنّ الله علیه بذلك۔ (خازن، ج ۴ ص ۴۱۵)

حضرت سعید بن المسیب فرماتے ہیں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے غلام میسرہ کے قافلے میں آپ ﷺ اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ نکلے تھے، ایک تاریک رات میں جبکہ آپ اونٹنی پر سوار جا رہے تھے اچانک ابلیس نے آپکی اونٹنی کی مہار پکڑ کر

Marfat.com

راستہ سے اس کا رُخ موڑ دیا، اور فوراً حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے اور ابلیس پر ایک ہلکی سے پھونک ماری جس سے وہ حبشہ میں جا گرا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لیکر قافلہ تک پہنچادیا، اللہ تعالیٰ اس احسان کو یہاں بیان فرماتے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے باپ حضرت یعقوب علیہ السلام کیلئے بھی لفظ ضلال استعمال کیا اس سے بھی ایسی ہی معانی مراد ہیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ انبیاء علیہم السلام سے عدول عن الصراط المستقیم ہوا ہو وہ گمراہ ہوئے ہوں۔ حاشا اللہ۔

(استفادہ: کمالین علیٰ جلالین، جواہر القرآن، تفسیر خازن، تفسیر عثمانی)

انیسویں بحث: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لفظ وِزر

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ (الم نشرح آیت ۲)

ترجمہ: اور اُتار رکھا ہم نے تجھ پر سے بوجھ تیرا۔

بحث: وِزرُ گناہ کو کہتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے گناہ سرزد ہوئے ہیں۔

وضاحت: یہ ہرگز نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہو، جیسا کہ ہم پیچھے دوسری آیات کی وضاحت میں بیان کر چکے ہیں۔

توجیہ ۱: اس آیت میں جس وزر کا ذکر ہے اس سے بعض مفسرین کرام نے وہ امور مباحہ بتائے ہیں جو کبھی کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بنابر تصور کسی حکمت کے صادر ہو جاتے تھے اور بعد میں ان کا خلاف حکمت و خلاف اولیٰ ہونا ثابت ہوتا تھا، اور آپ بوجہ عُلوّشان وغایت قرب کے اس سے ایسے ہی مغموم ہوتے تھے جس طرح گناہ سے کوئی مغموم ہوتا ہے، اس میں بشارت ہے ان امور پر مواخذہ نہ ہونے کی۔ کذا فی الدر المنثور۔ (استفادہ: بیان القرآن)

توجیہ ۲: وزر سے کفر و شرک اور معاصی کا بوجھ مراد ہے یعنی ہم نے کفر و شرک اور دیگر معاصی کا بوجھ ہٹا دیا اور ان کو آپ کے قریب تک نہ آنے دیا اور آپ کو ان سے بالکلیہ محفوظ رکھا، الذی انقض ظهرك ماضی بمعنی مستقبل ہے یعنی آپ کو ایسے

Marfat.com

تمام گناہوں سے محفوظ رکھا کہ اگر ان میں سے ایک بھی آپ سے ایسا گناہ صادر ہو جاتا تو آپکی کمر توڑ دیتا مگر واقع میں ایسا نہیں ہوا اور ہم نے آپ سے ایسا کوئی گناہ صادر نہیں ہونے دیا، یعنی حفاظت کر دی۔

عصمناك عن الوزر الذی ینقض ظهرك لوكان ذالك الوزر حاصلا فسمی العصمة وضعاً مجازاً۔ (تفسیر جواہر القرآن وتفسیر خازن، ج ۴ ص ۴۱۷)

توجیہ ۳: وزر لغت میں ثقل کو کہتے ہیں، پہاڑ سے تشبیہ دیتے ہیں، کیونکہ وہ بھی بار گراں ہوتا ہے، اس آیت میں جس بارِ گراں کو بیان کیا جاتا ہے وہ رسالت کی تبلیغ کا حق ادا کرنا ہے، جس سے انقض ظهرك کو تعبیر کیا گیا ہے یہ دعوت حق و تبلیغ احکام کی پابندی برابر بارِ گراں ہے، اس سے پہاڑ زمین اور آسمان ڈر گئے تھے۔

المراد بذالك ما اثقل ظهره من اعباء الرسالة حتی یبلغها لان الوزر فی اللغة الثقل تشبیها بوزر الجبل۔ (خازن ج ۴ ص ۴۱۷)

مطلب ہے کہ تبلیغ رسالت کے وزن کو آپ پہاڑ جیسا بھاری سمجھ رہتے تھے اسکو ہم نے آپ پر آسان کر دیا کہ آپ اسکو احسن طریقہ سے ادا کر سکے۔

توجیہ ۴-۵: اس سے مراد وہ غم فراق ہے جو کچھ عرصہ کیلئے بسبب انقطاع الوحی پیش ہوا تھا، اس غم نے آپ کی قوت صبر توڑ دی تھی پھر اللہ تعالیٰ نے مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی۔ اور الم نشرح کی ان آیات سے تسلی دے کر آپ کے دل کو قرار اور طبیعت کو سکون بخشا۔ (استفادہ: بیان القرآن، جواہر القرآن، خازن، مظہری)

وَصَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ سَمِیْعٌ مُّجِیْبُ الدُّعَآءِ

وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ

ابو اللیث غلام محمد میمن
ضلع خیر پور میرس

Marfat.com

نماز
اور
روحانی سائنس

مؤلف: ڈاکٹر حشمت جاہ

CITY BOOK POINT
Naveed Square.
Urdu Bazzar, Karachi
Ph # 021-2762483
E-Mail: citybookurdubazaar@gmail.com

Marfat.com

معصومیت انبیاء علیہ السلام

مؤلف

ابواللیث غلام محمد میمن

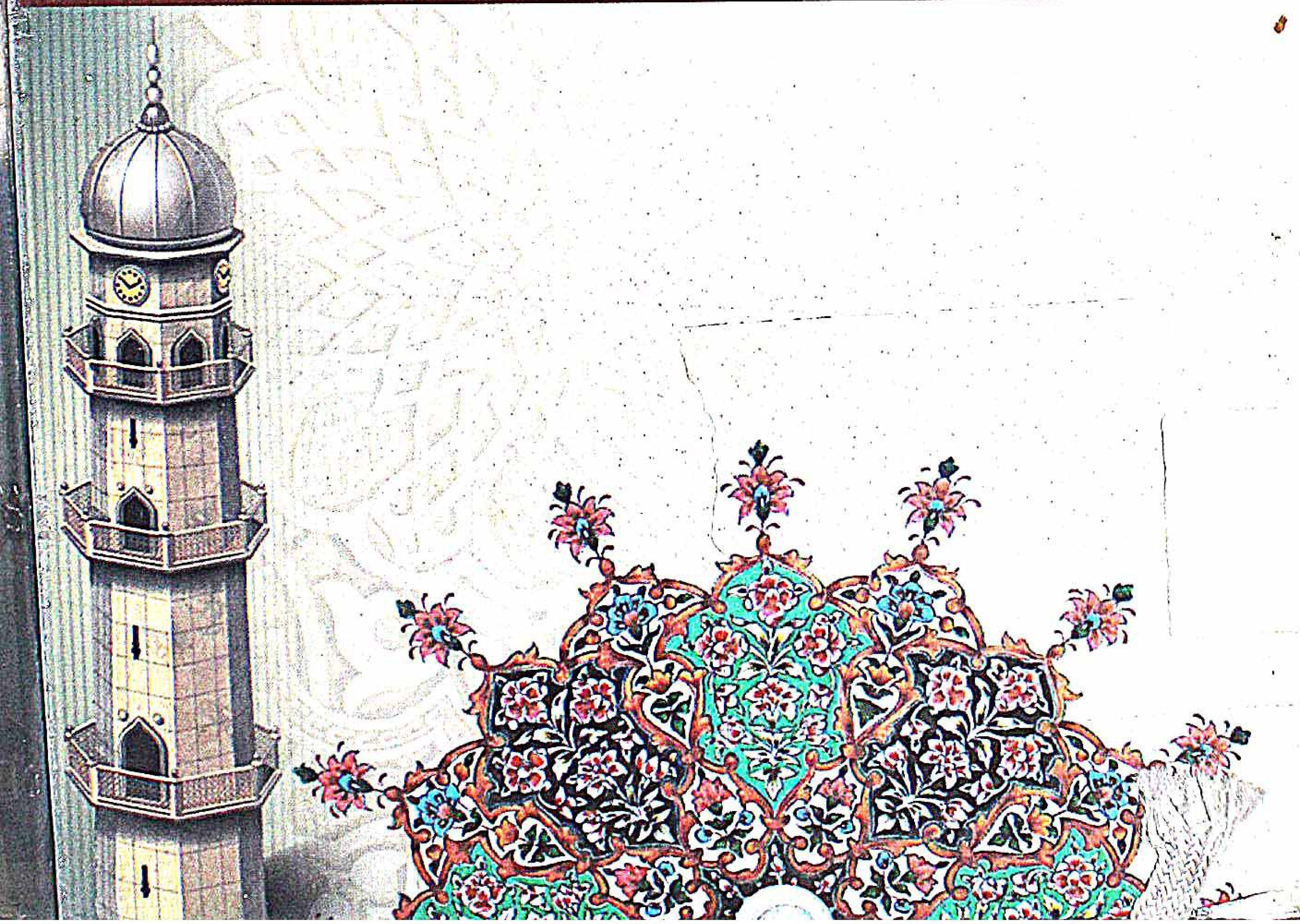

Marfat.com